معجزہ کیا ہے؟
از
حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم
مہتمم دارالعلوم دیوبند

پیش لفظ

"معجزہ کیا ہے" دراصل حضرت حکیم الاسلام مدظلہ کی ان معرکۃ الآراء تقاریر میں سے ہے جو اپنی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے عوام و خواص دونوں طبقوں کے لیے انفرادی خصوصیت کی حامل ہیں۔

زیر نظر کتاب میں انتہائی مربوط اور دلچسپ انداز میں معجزوں کی حقیقت اور انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں پر ان کے ظہور کے وجوہ پر ایک جامع اور مدلل بحث کی گئی ہے۔

پیغمبران حق ان گم کردہ راہ قوموں کی راہبری اور راہنمائی کے لیے اس عالم میں تشریف لائے جو مسبب اسباب اور اس کی مشیتوں سے انحراف کر کے صرف اسباب و عوارض کے جویاں بن کر رہ گئے۔

ظاہر ہے کہ ایسے تیرہ و تار ذہنوں کو علم و حقانیت سے منور کرنے کے لیے محض علمی دلائل کافی نہیں ہو سکتے جب تک کہ ان کے ساتھ کچھ ایسے معاون براہین نہ ہوں جن کا تعلق مشاہدہ سے ہوتا ہے اور وہ مشاہداتی دلائل

کی فوقیت و برتری تمام دنیوی خوارک اور شعبدوں پر ثابت اور مسلّم ہو گئے
اُن کا من اللہ ہونا اور ان کی نا قابلِ انکار صداقت پر منکر ذہن کو خمیدہ سر ہونے
پر مجبور کر کے اس کے لیے بابِ توفیق وا کر سکے۔

ان باریک تر مسائل پر حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی کے ذہن رسا
نے جو نکتہ سنجیاں فرمائی ہوں گی ان کا اندازہ اہل علم و دانش بالخصوص اور
عوام بالعموم بہ آسانی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ کتاب کی افادیت اور متوقع مقبولیت
کے سلسلے میں حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ العالی
کا اسم گرامی ہی شاہد معتبر ہے۔

محمد اسلم رمزی قاسمی

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ وَ
نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور
انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا
مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادِی لہ ونشہد
ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشہد
ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہ
ارسلہ اللہ الی کافۃ الناس بشیرا ونذیرًا ط وداعیًا
الیہ باذنہ وسراجا منیرا ط صلی اللہ تعالیٰ علیہ
وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیما کثیرًا
کثیرا ط

امّا بَعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ط بسم
اللہ الرحمٰن الرحیم ط لقد ارسلنا رسلنا بالبیّنٰت و
انزلنا معہم الکتاب لیقوم الناس بالقسط وانزلنا
الحدید فیہ باس شدید ومنافع للناس ولیعلم
اللہُ من ینصرہ ورسلہ بالغیب ط ان اللہ قوی
عزیز ط پ ۲۷، سورۃ الحدید۔

بزرگانِ محترم!

یہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے، جو اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہے۔ اس میں حق تعالیٰ شانہٗ نے دین کے چند بنیادی اساسی مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ آج انہی کے بارے میں آپ حضرات سے کچھ عرض کر دوں گا۔

ترجمہ:

"ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا بینات کے ساتھ یعنی کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ کہ جن سے رسولوں کو پہچانا جا سکے اور رسولوں کے ساتھ ہم نے نازل کی کتاب جس سے قوانینِ خداوندی پہچانے جا سکیں، امر و نہی سامنے آئیں اور احکام ربانی واضح ہوں۔ اور کتاب کے ساتھ ہم نے میزان[1] بھی بھیجی کہ جس میں ناپ تول کر اندازہ کیا جا سکے کہ واقعی یہ چیز حق ہے اس کے دلائل، اس کے علل[2] اور اس کے اسرار[3] بھی ہم نے ساتھ میں بھیجے۔"

تو اس آیت میں تبلایا گیا کہ ایک بڑا انعام اللہ تعالیٰ کا نبوت ہے جو دنیا میں بھیجی گئی۔

---

۱ میزان سے مراد علمی دلائل ہیں جن سے تعلیم کے صحیح یا غلط ہونے کی جانچ تول کی جا سکتی ہے
۲ وجوہات ۳ راز بھید

ایک نبوت کی دلیل ہے جو بینات[1] ہیں، ایک نبوت کا اثر[2] ہے جو اس کی تعلیمات ہیں جس کو کتاب سے تعبیر[3] کیا گیا۔ ایک[4] اس اثر کے وجوہ[5] اور شواہد[6] ہیں کہ جن کو میزان سے تعبیر کیا گیا۔

تو نبوت اور بینات اور کتاب اور میزان یہ چار نعمتیں ہیں جن کا اس آیت کریمہ میں ذکر فرمایا گیا۔

دنیا جانتی ہے کہ یہ عالم ظلمانی[7] ہے اس میں اندھیرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سب سے بڑا روشن چراغ اس میں انسان ہے لیکن خود انسان اپنی جبلّت[8] کے اعتبار سے ظلمانی ہے، جتنے اس کے پیدائش کے مادے ہیں وہ سب ظلمانی، اس کی جائے پیدائش وہ سب ظلمانی، اس کی پیدائشی خلقت[9] اور جبلت میں ظلم[10] اور ظلمات[11] دونوں رکھے ہوئے ہیں۔ صرف اگر خوبی ہے انسان میں تو وہ استعداد[12] اور صلاحیت کی ہے کہ اگر اس میں کسی خیر کو ڈال دیا جائے تو وہ قبول کر لیتا ہے۔ فعل[13] کے درجہ میں کوئی خوبی انسان کی ذات میں موجود نہیں۔ اسی کو ایک موقعہ پر قرآن کریم نے ارشاد فرمایا۔

اس صلاحیت کے بارے میں کہ،

---

۱ معجزات ۲ نتیجہ ۳ اس فقرے کا مطلب ہے کہ نبوت کے اثر یعنی تعلیمات کے لیے قرآن نے کتاب کا لفظ استعمال کیا، مطلب یہ ہوا کہ نبوت کی تعلیمات کے لیے آسمانی کتاب بھیجی۔
۴ یعنی آسمانی تعلیمات کے حق ہونے کیلئے ۵ اسباب اور دلائل ۶ ثبوت اور مثالیں ۷ اندھیرے بد
۸ طبیعت ۹ خمیر ۱۰ بے انصافی ۱۱ اندھیرے ۱۲ قابلیت ۱۳ لیاقت ۱۴ عملی صورت میں

انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسان ط

"ہم نے اپنی امانت[1] پیش کی آسمانوں پہ، زمین پہ، دریاؤں پہ، پہاڑوں پہ، فابین سب نے انکار کر دیا۔

کہ اس امانت کو نہیں اٹھا سکتے، ہم میں قوت نہیں، یہ کہہ کے پیچھے ہٹ گئے۔ حضرتِ انسان بھی کھڑے ہوئے تھے، انہوں نے آگے بڑھ کر عرض کیا کہ اس امانت کے لیے میں تیار ہوں۔

وحملہا الانسان ط — انسان نے وہ امانت اٹھالی

فرمایا حق تعالیٰ نے کہ،

انہ کان ظلوما جہولا ط

تھا، نرا ظلوم[2] اور جہول!! اسی لیے تو امانت اٹھالی۔

تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے —— کہ کام تو انسان نے وہ کیا جو کائنات میں کوئی نہ کر سکا۔ بڑی بڑی مخلوقات آسمان، زمین، دریا اور پہاڑ سب عاجز رہ گئے۔

اٹھا تو یہ ضعیف البنیان انسان اٹھا۔ اور اس نے کہا "میں امانت اٹھانے کو تیار ہوں"

---

[1] امانت سے مراد تمام مفسرین کے نزدیک شریعت کے احکام ہیں کہ جن کو ادا کرنے سے اجر و ثواب اور نہ ادا کرنے سے گناہ اور عذاب ہوتا ہے [2] بڑا ظالم [3] بڑا جاہل [4] کمزور بنیاد والا۔

تو وہ کام کیا —— کہ جو کائنات میں کوئی نہ کر سکا، مگر خطاب یہ ملا کہ بڑا ظالم اور بڑا جاہل تھا۔

تو سوال یہ ہے کہ کوئی تعریف کا کلمہ فرمایا جاتا، کوئی مدح کی جاتی تو —— انسان کچھ خوش ہوتا کہ میں نے اگر کوئی بڑا کام کیا ہے تو مجھے صلہ[1] ملا۔

مگر صلہ یہ ملا کہ بڑا ظالم اور بڑا جاہل تھا۔ پھر یہ نہیں کہ یوں فرما دیا گیا ہو کہ انہ کان ظالما جاھلا ط ظالم تھا، جاہل تھا، ظلوم کہا گیا، مبالغے کا صیغہ کہ بڑا ظالم...... اور بڑا جاہل تھا۔

تو انسان بے چارہ دل مسوس[2] کر رہ گیا کہ کام تو اتنا بڑا کیا جو کوئی نہ کر سکا اور انعام یہ ملا کہ بڑا ظالم...... اور بڑا جاہل تھا جو ظاہر میں ایک مذمت[3] ہے۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو اس سے زیادہ مدح اور تعریف انسان کی نہیں ہو سکتی جو ان کلمات سے حق تعالیٰ نے فرمائی کہ یہ بڑا ظالم ہے بڑا جاہل ہے۔

اس لیے کہ ظالم اس کو کہتے ہیں جس میں عادل بننے کی صلاحیت ہو اس لاؤڈ سپیکر کو ہم ظالم نہیں کہہ سکیں گے اس لیے کہ اس میں عادل بننے کی کوئی صلاحیت نہیں۔

---

[1] بدلہ [2] دل پکڑ کر رہ گیا، صدمے سے چپ چاپ رہ گیا [3] برائی بیان کی گئی ہے

آسمان کو ہم ظالم نہیں کہہ سکیں گے اس لیے کہ اس میں عادل بننے کی کوئی صلاحیت نہیں۔

ہم ان پہاڑوں کو اور دریاؤں کو جاہل نہیں کہہ سکتے اس لیے کہ جاہل وہ ہے جو عالم بن سکتا ہو۔ ان میں عالم بننے کی کوئی صلاحیت نہیں۔

اس لیے نہ یہ ظالم کہلائے جا سکتے ہیں۔ نہ جاہل۔

اگر ظالم اور جاہل بن سکتا ہے تو انسان بن سکتا ہے کیونکہ ظالم کے معنی یہ ہیں کہ عادل بننے کی اس میں صلاحیت[1] ہو۔ جاہل کے یہ معنی یہ ہیں کہ عالم ہونے کی اس میں استعداد[2] ہو۔

تو اب اس خطاب کا حاصل یہ نکلا ——————

کہ انسان بڑا ظالم تھا یعنی اس وقت ظالم ہے، مگر بننے والا ہے یہ بہت بڑا عادل۔ اس میں انصاف کی اور اعتدال[3] کی صلاحیت ہے۔

یہ بڑا جاہل ہے لیکن اگر کائنات میں کوئی عالم بنے گا تو یہی بن سکتا ہے۔ دوسرا نہیں بن سکتا۔ تو بالفعل[3] ظالم ہے اور بالقوہ[4] عادل ہے۔ بالفعل جاہل ہے اور بالقوہ عالم ہے۔

تو دوسرے لفظوں میں اس کا حاصل[5] یہ نکل آیا کہ انسان نے امانت قبول کی، استعدادِ قبول کی، صلاحیت قبول کی عالم و عادل بننے کی، اس لیے

---

[1] قابلیت، لیاقت [2] نہ کمی نہ زیادتی [3] موجودہ حالت [4] بالقوہ کا مطلب ہو ہے کہ اس میں قابلیت اور طاقت اس چیز کو حاصل کرنے کی ہے [5] مطلب نتیجہ۔

کہ یہ ظالم اور جاہل تھا اس امانت کو یہی قبول کر سکتا تھا کہ بالقوہ یہ عادل بن جائے، بالقوہ عالم بن جائے۔

تو اس آیت کریمہ نے بتلایا کہ انسان میں اگر کوئی خوبی ہے تو وہ صلاحیت[1] اور استعداد کی ہے۔

ماں کے پیٹ سے کوئی ہنر لے کر نہیں آتا۔ اس لیے کہ سب سے بڑے کمال انسان کے لیے دو ہی ہیں

"ایک علمی قوت"

اور "ایک عملی قوت"

انہی دو سے دنیا میں انسان سر بلند ہوتا ہے۔

ان دونوں کی صلاحیت اس کے اندر ہے ماں کے پیٹ سے انسان نہ علم لے کر آیا، نہ عدل، اور نہ انصاف لے کر آیا، نہ اعتدال لے کر آیا۔

علم کے بارے میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

واللہ اخرجکم من بطون امہاتکم لا تعلمون شیئا وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ قلیلا ما تشکرون ۝

"ہم نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا اس حالت میں

---

[1] قابلیت، لیاقت۔

کہ تم ذرہ برابر علم نہیں رکھتے تھے :۔

لا تعلمون شیئًا یہاں نکرہ نفی کے نیچے آرہا ہے اور عربیت کا قاعدہ ہے کہ نکرہ جب نفی کے نیچے آتا ہے تو فائدہ عموم کا دیتا ہے تو لا تعلمون شیئًا کا یہ مطلب نکلا کہ ذرہ برابر تمہارے اندر علم نہیں تھا۔ انسان کا بچہ ایک مضغۂ[1] گوشت بنا ہوا آتا ہے، نہ اس میں سیاہ وسفید کی تمیز، نہ اچھے برے کا امتیاز۔ ایک گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے

فرماتے ہیں ہم نے اس میں سننے کی طاقت رکھی تاکہ سن سن کر علم حاصل کرے۔ دیکھنے کی طاقت رکھی تاکہ دیکھ دیکھ کر معلومات حاصل کرے بوجھنے کی طاقت رکھی تاکہ سمجھ کر تدبّر[2] و تفکّر[3] سے معلومات میں اضافہ کرے۔ تو اس کے اندر علم بڑھانے کے آلات رکھ دیئے، صلاحیت رکھ دی، جب ان آلات کو استعمال کرے گا اس کا علم بڑھتا جائے گا۔ جاہل سے عالم بنتا جائے گا، ظالم سے عادل بنتا جائے گا۔

اب یہ کہ وہ ان آلات کو استعمال ہی نہ کرے، نہ آنکھ کھول کے دیکھے، نہ کانوں کو کھول کر سننے کی کوشش کرے، نہ دل کو ذرا سا فراغ کر کے سمجھنے کی کوشش کرے تو یہ کفرانِ[4] نعمت ہے کہ ہم نے تو

---

[1] گوشت کا ٹکڑا [2] دور اندیشی
[3] سوچ سمجھ [4] نعمت کی ناشکری

سمجھنے کے اور معلومات کے سارے آلات دیدیئے، اب کوئی استعمال نہ کرے تو اسی کا قصور ہے اور اسی کی ذمہ داری ہے۔

تو حق تعالیٰ نے بڑے انعامات انسان پہ کیئے کہ علم کی صلاحیت دی، گو پیدا شدہ عالم نہیں اور ماں کے پیٹ سے علم لے کر نہیں آیا تو یہاں نفی کر دی کہ لا تعلمون شیئًا ط

تو سب سے بڑا کمال انسان کے لیے علم تھا، اسی کی نفی ہو گئی کہ اس میں موجود نہیں، ذاتی طور پہ انسان علم سے کورا پیدا ہوتا ہے۔

اخلاقی قوّت :۔ وہ عمل کی قوّت ہے، اخلاق ہی اندر سے عمل کو ابھارتے ہیں۔

اگر کسی میں شجاعت[1] کا خلق رکھا ہے تو حملہ آوری اور ہجوم اور اقدام[2] کے افعال[3] سرزد[4] ہوں گے، اگر کسی میں شکر کا خلق رکھا ہوا ہے تو زبان رطبُ اللّسان[5] ہوجائے گی شکر گزاری میں کہ وہ ہاتھ پیر دل سے شکر گزاری کرے گا۔

اگر انسان کے اندر مادہ رکھا ہوا ہے سخاوت کا تو داد و دہش کے افعال اس سے سرزد ہوں گے۔

تو افعال، اخلاق سے نمایاں ہوتے ہیں، اخلاق بمنزلہ بیج کے ہیں اور افعال بمنزلہ ثمر[6] اور شاخوں کے ہیں۔ بیج اگر نہ ہو تو درخت

---

[1] بہادری [2] پیش قدمی [3] کام [4] ظاہر [5] تر زبان [6] پھل

نہیں اُگ سکتا، اس لیے انسان کے قلب کے اندر جیسے مادے ہوتے ہیں ویسا ہی اس سے افعال کا ظہور ہوتا ہے۔

تو پیدائشی طور پر انسان کے اندر اخلاق فاضلہ[۱] رکھے ہوئے نہیں ہیں، مطلقاً خلق موجود ہے لیکن اس کا اعتدال اور صحیح طور پر اپنے مصرف[۲] میں صرف[۳] کرنا اس کا کوئی وجود نہیں۔

بلکہ اگر دیکھا جائے تو اخلاق بدی کے موجود ہیں جن کو تعلیم سے اور تربیت سے بدلنا پڑتا ہے۔

اگر آدمی تعلیم و تربیت نہ پائے تو اس کی بدخلقی نمایاں رہتی ہے حضرت یوسف علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ:-

وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء الا ما رحم ربی۔

"میں برأت[۴] نہیں کرتا اپنے نفس کی، نفس تو برائی کا حکم کرتا ہے"

تو خلقی طور پر انسان کا نفس شر[۵] کا مجموعہ ہے، اس سے برائیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس کو ٹرینڈ (TRAINED) کر کے، تمرین[۶] کر کے تعلیم دے کر، تربیت دے کر بھلائی کی طرف لایا جاتا ہے۔

---

۱ اچھے اخلاق ۲ خرچ کرنے کی جگہ ۳ خرچ ۴ بریت
۵ برائی ۶ مشق۔

پیدائشی طور پر انسان بخیل واقع ہوا ہے۔ سخی واقع نہیں ہوا، تو پیدا شدہ بچے کو ذرا شعور ہوگا تو جو چیز اس کے سامنے رکھیں گے ہاتھ سے اٹھا لے گا۔ اور منہ میں لے جانے کی کوشش کرے گا یعنی قبض[۱] اور بخل[۲] یہ اس کی ذاتی جبلت[۳] ہے، داد و دہش[۴]، اس کی ذاتی جبلت نہیں، صلاحیت ہے داد و دہش کی، لیکن بالفعل[۵] اگر موجود ہے تو قبض اور بخل ہے۔ اٹھائے گا اور ہضم کرنے کی کوشش کرے گا آپ محنت کر کے، تربیت دے کر اس کو سخی بنانے کی کوشش کریں گے۔

فطری اور خلقی طور پر انسان میں صبر و تحمل کا مادہ نہیں ہے۔ جزع[۶] و فزع کا ہے، ذرا مصیبت دیکھی گھبرا گیا، واویلا شروع کر دی۔ ذرا کوئی چیز پاس آگئی اترا گیا اور آپے سے باہر نکل گیا، سمائی اور صبر و تحمل، محنت کے بعد حاصل ہوتا ہے، جب کہ اس کو تربیت دی جائے اسی لیے اخلاقی ادارے بھی قائم کیے جاتے ہیں تاکہ اخلاق کو تربیت دی جائے۔ تعلیمی ادارے قائم کیے جاتے ہیں تاکہ علم پہنچایا جائے۔

---

۱ "قابو کرنا ۲ کنجوسی ۳ پیدائشی طبیعت۔ ۴ خیر خیرات اور سخاوت ۵ اس وقت ۶ گھبراہٹ اور بے صبری۔

تو مدارس کا وجود، خانقاہوں[1] کا وجود اس کی دلیل ہے کہ خلقی طور پر نہ انسان میں علم ہے، نہ اخلاقِ[2] فاضلہ ہیں۔ ورنہ خانقاہوں کی ضرورت تھی نہ مدارس کی ضرورت تھی۔

تو ان کا قائم ہونا، جد و جہد[3] کرنا اور سارے انسانوں کا پسند کرنا کہ کوئی مدرسہ قائم ہو، کوئی تعلیم گاہ قائم ہو یہ دلیل اس کی ہے کہ وہ اپنے کو طبعی[4] طور پہ جاہل سمجھے ہوئے ہیں۔

اگر سب کے سب پیدائشی علم رکھتے تو مدارس کی ضرورت نہیں تھی سارے علماء پیدا ہوتے، اگر سارے کے سارے با اخلاق ہوتے تو خانقاہوں اور مربیانِ[5] اخلاق کی ضرورت نہیں تھی کہ ان کو تمرین[6] دے کر پاکیزہ اخلاق سکھائیں۔

تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان ذاتی طور پہ کمالات سے کورا واقع ہوا ہے بلکہ شر کا اس کے اندر غلبہ ہے۔ اور ایک انسان ہی میں کیا ہر چیز میں خلقی طور پہ برائی رکھی ہوئی ہے۔ اس کے اندر بھلائی محنت سے لائی جاتی ہے اگر محنت چھوڑ دی جائے تو برائی پیدا کرنے کے لیے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہر چیز میں سے وہ خلقی طور پہ خود اُبھرتی ہے۔

آپ ایک مکان بنائیں۔ مکان کی خوبی یہ ہے کہ صاف ہو، ستھرا ہو

---

[1] بزرگوں سے تربیت حاصل کرنے کی جگہیں [2] اچھے اخلاق [3] کوشش
[4] پیدائش [5] اخلاق سدھارنے والے [6] مشق

خوش رنگ ہو، دیدہ زیب ہو، ڈیزائن (DESIGN) اچھا ہو اس سب کے لیے آپ کو محنت کرنی پڑے گی، معمار لائیں گے مکان بن جائے گا تو فراش[1] رکھیں گے کہ وہ جھاڑے جھٹکے، تب جا کے یہ خوبیاں برقرار رہیں گی۔

لیکن اگر مکان کو آپ ویرانہ بنانا چاہیں، اجاڑنا چاہیں تو کسی محنت کی ضرورت نہیں، اس کے صحیح رکھنے پر جو محنت صرف کر رہے تھے وہ چھوڑ دیجیے چند دن کے بعد گرد آئے گی پھر پلستر اکھڑے گا، پھر اینٹیں جھڑیں گی، پھر چھت گرے گی، پھر دیواریں آپڑیں گی۔ مکان کھنڈر ہو جائے گا۔

تو کھنڈر بنانے کے لیے کسی محنت کی حاجت نہیں ہے۔ صاف ستھرا مکان بنانے کے لیے محنت کی حاجت ہے جب آپ نے محنت چھوڑ دی تو کھنڈر بننے کی باتیں خود اس کی ذات میں موجود تھیں وہ ابھر آئیں۔

آپ ایک باغ لگاتے ہیں، باغ کی خوبی یہ ہے کہ سر سبز ہو، شاداب ہو، خوش رنگ پتے اور پھول ہوں، خوشبودار ہوں، ان سب کے لیے محنت اٹھانی پڑتی ہے، مالی رکھیں گے۔ ہالی[2] رکھیں گے کہ جو تھاولوں[3]

---

[1] صفائی کرنیوالا خادم [2] ہل چلانیوالا [3] درختوں کے گرد پانی دینے کے گڑھے۔

کو دیکھیں، کتر بیونت[1] کریں، اس کی جڑوں کو پانی دیں، صاف کریں تب جا کے باغ سر سبز رہے گا۔ اس محنت سے آپ نے سرسبزی پیدا کی۔

• لیکن اگر باغ کو اجاڑنا چاہیں، جھاڑ جھنکار بنانا چاہیں تو کسی مالی کے رکھنے کی ضرورت نہیں۔ کسی مالی موالی[2] کے رکھنے کی ضرورت نہیں، مالی کو موقوف کیجیے۔ صرف نہر بند کر دیجیے۔ بیس دن کے بعد یہی باغ جھاڑ جھنکار بن جائے گا۔ معلوم ہوا کہ خرابی اس کی ذات میں چھپی ہوئی تھی جس کو آپ نے محنت سے دبایا تھا، محنت ختم کر دی اندرونی خرابی ابھر آئی۔

تو خرابی ہر چیز کی جبلت میں رکھی ہوئی ہے اور خوبی محنت کر کے لائی جاتی ہے۔ ایک کھانا ہے، کھانے کی خوبی یہ ہے کہ خوش رنگ ہو، خوش ذائقہ ہو، خوشبودار ہو۔ اس کے لیے آپ محنت اٹھاتے ہیں، ہوا دان بنوائیں گے، نعمت[3] خانہ بنوائیں گے۔ ٹھنڈی جگہ میں اس کو رکھیں گے کہ دھوپ نہ لگے، خراب نہ ہو،

لیکن اگر کھانے کو سڑانا ہے، بسانا ہے، بدبودار کرنا ہے تو بدبودار بنانے کے لیے کسی نعمت خانہ کے بنانے کی ضرورت نہیں۔ بس ویسے ہی چھوڑ دیجیے، صبح کو کھانا سڑا ہوا ہوگا، بدبو بھی اٹھی ہوئی ہو گی۔ رنگ

---

۱ کانٹ چھانٹ ۲ نوکر چاکر ۳ ایسی الماری جس میں کھانا محفوظ رہ سکے

بھی بگڑ جائے گا، ذائقہ بھی خراب ہو جائے گا۔ معلوم ہوا کہ خرابی اس کے اندر موجود تھی جس کو آپ کی محنتوں نے دبا دیا تھا۔ جب آپ نے محنت ختم کر دی، اندرونی خرابی ابھر آئی۔

تو آپ کو کائنات کی ہر چیز میں، ہر ذرے میں یہی محسوس ہوگا کہ خرابی ذات میں ہے، خوبی محنت کر کے عارضی طور پہ لائی جاتی ہے۔ انسان انہی چیزوں کا تو مجموعہ[1] ہے۔ یہی کائنات کے ذرے ملے تو آدمی بن گیا، یہی گارا مٹی ملی تو انسان تیار ہو گیا، انسان کا نفس بن گیا، اس کے نفس میں بھی یہی خرابی جبلی[2] ہے کہ انسان پیدائشی طور پہ کچھ شر اور برائی لے کر آتا ہے اس کو بھلا بنانے کے واسطے آپ محنت اٹھاتے ہیں، تمرین کرتے ہیں، تربیت دیتے ہیں، تب جا کے انسان کو انسان بننا نصیب ہوتا ہے۔

خوب کہا ہے کسی شاعر نے کہ

قرنہا باید تا یک سنگ خارا از آفتاب
لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

"سالہا سال قرنہا قرن[3] کی مدت چاہیے کہ ایک سنگ خارا[4] کا ٹکڑا آفتاب کی دھوپ کو سہہ سہہ کر اس کی تپش کو اپنے

---

۱ یعنی اربعہ عناصر، آگ، پانی، مٹی، ہوا وغیرہ ۲ پیدائشی ۳ لمبا زمانہ
۴ سخت پتھر

اندر جذب کر کے اپنی صلاحیتوں کو ابھارے اور لعلِ[1] بدخشاں
بن جائے، عقیقِ یمن[2] بن جائے۔"

یہ ایک دن میں نہیں ہوتا، قرنِ ہا قرن کی مدت تک اسے آفتاب
کی تپش کو سہنا پڑتا ہے، تب جا کے بے قیمت پتھر کا ٹکڑا ایک باقیمت
لعل بدخشاں بنتا ہے۔ اور کہا کہ

ماہ ہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ بعد کشت
جامہ گردد شاہدے را یا شہیدے را کفن

"مہینوں کی مدت چاہیئے کہ بنولے کا ایک دانہ مٹی میں جا کر مٹی ہو
جائے، اپنے نفس کو پامال کر دے، ختم کر دے اور مٹی میں چھپا دے تب
اس سے کونپل ابھرے گی، درخت پیدا ہوگا، روئی لگے گی، اس روئی کو
پینا جائے گا، لکاتا جائے گا، سوت بنے گا، کپڑا بنایا جائے گا درزی
قطع کرے گا تب وہ بنولا اس قابل بنا کہ کسی محبوب کے اوپر دیدہ زیب
جامہ بن جائے اور اس کی قیمت ہو اور دنیا اس کی تعریف کرے۔

تو بنولے کے دانے کو کتنی مصیبتیں سہنی پڑیں۔ ان مصائب سے گزر
کر اس کو یہ قیمت حاصل ہوئی کہ اس کے کپڑے کو پہن کر مجلسوں میں آیا جائے
اس کپڑے کی تعریف کی جائے، مجلس والے کہیں کپڑا بڑا قیمتی ہے، آپ
نے کہاں سے خریدا، اس کی قیمت کیا ہے، قیمت بتائی جاتی ہے، لوگ

[1] اعلیٰ قسم کا لعل۔ [2] اعلیٰ قسم کا عقیق

تعریف کرتے ہیں کہ ہمیں بھی اس دکان کا پتہ بتا دیجیئے، ہم بھی یہ کپڑا
منگوائیں!

اس کپڑے کو یہ فروغ کب حاصل ہوا؟ جب کہ بنولے کے دانے
نے اپنی ہستی مٹا دیا، اس نے زمین کا بوجھ برداشت کیا، روئی کے
درخت نے آفتاب کی تپش برداشت کی پھر روئی بنی اور پینی گئی اور
کپڑا بنا۔ تو مہینوں کی مدت چاہیئے کہ بنولہ دیدہ زیب جامہ بن جائے۔

اور آگے کہتا ہے شاعر کہ ؎

سالہا باید کہ تا یک کودکے از درس علم
عالمے گر، ذکیہ یا شاعرِ شیریں سخن

"سالہا سال کی مدت چاہیئے کہ ایک نادان بچہ، ایک کودک[1]
نادان ایک طفلِ مکتب کسی مکتب[2] میں بٹھایا جائے، آٹھ نو
برس میاں جی کی سختیاں سہے، استادوں کی غلامی کرے اس
کے بعد جا کر یا وہ عالم بنے گا یا شاعر شیریں سخن بنے گا۔"

تو عالم بنانے کے لیے سالوں کی مدت درکار ہے مدرسے قائم کرنا
لازمی رکھنا، معلّم رکھنا پڑتا ہے تب جا کے آدمی، آدمی بنتا ہے۔
لیکن دنیا میں آپ نے کہیں نہیں سنا ہوگا کہ کوئی مدرسہ جاہل بنانے
کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ جاہل تو بنا بنایا پیدا ہوتا ہے۔ اس کے لیے

[1] چھوٹا بچہ [2] مدرسہ

مدرسے کی کیا ضرورت ہے یا کوئی ادارہ بدا اخلاق بنانے کے
قائم کیا گیا ہے۔ یہ تحصیلِ حاصل[1] ہے۔ بداخلاق تو تھا ہی، نیک اخلا
بنانے کے لیے ادارے کی ضرورت ہے۔

تو ان گزارشات سے میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ا
اپنی ذات سے شر[2] لے کر آیا ہے، اس کے نفس کے اندر شرور[3] جم
ہیں۔ اس میں برائیوں کے مادے ہیں مگر انہیں برائیوں میں اگر کوئی خو
ہے تو صلاحیت و استعداد کی ہے کہ اگر ان خرابیوں پہ ان کی ضد[4] کو
ڈال دیا جائے تو آدمی وہ قبول کر لیتا ہے، جہالت پہ تعلیم دی جا
تو علم کو قبول کر لے گا۔ ظلم کو اگر سنوارا جائے تو عادل بن جائے گا کو
بدکار ہو اور اس کو تربیت دی جائے تو نیکوکار بن جائے گا۔

تو برائیوں کے مادے موجود ہیں مگر اس کی ضدیں جتنی بھلائیاں تھ
ان کی صلاحیتیں بھی موجود ہیں۔ تو ساری خوبیوں کا مجموعہ وہی عمدگی
ہیں، وہی خوبیاں ہیں۔ علم اور اخلاق۔ اس واسطے علم و اخلاق کی صلا
رکھی گئی۔ بس یہی خوبی ہے۔ لیکن ان صلاحیتوں کو ابھارنے کے لیے
ضرورت تھی کہ کوئی محرک ہو جو ان صلاحیتوں کو ابھار کر سے، سو انبیا

---

[1] بے فائدہ کوشش [2] بگاڑ، فساد، شرارت۔
[3] شر کی جمع ہے، معنی برائیاں۔
[4] مخالف صفت۔

علیہم السلام کو حق تعالیٰ نے بھیجا، وہ معلّم[1] بن کر آئے، مربیِ اخلاق[2] بن کر
آئے۔ انبیاء کی تعلیم سے جاہل عالم بنے، ظالم عادل بنے۔

ہر نبی کے دور میں یہی رہا ہے کہ جن کی صلاحیتیں ابھرنی ہوتیں اور
جن کی تقدیر یاور[3] ہوئی، انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے ابھر گئے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اور ایسے
وقت تشریف لائے کہ بدی کا دور دورہ تھا۔ حجاز[4] میں بھی بدی کا دور
دورہ تھا۔ حجاز کے اردگرد بھی دنیا میں بدی پھیلی ہوئی تھی۔ پورا عالم
ظلمت کدہ اور جہالت کدہ بنا ہوا تھا۔ جہل اور ظلم کی بھی فراوانی[5] تھی
امتیں خالق و مخلوق کا فرق بھلا چکی تھیں، خالق کی صفات مخلوق میں مان
لی تھیں اور مخلوق کی صفات خالق میں تسلیم کی ہوئی تھیں۔ نہ خالق کو خالق
سمجھا جاتا تھا۔ نہ مخلوق کو مخلوق۔

ایک قوم کہتی تھی کہ عیسیٰ علیہ السلام میں الٰہی خصوصیات موجود ہیں۔
بعض نصاریٰ کا دعویٰ تھا کہ وہ عالم الغیب بھی ہیں۔ وہ قادر علی
الاطلاق[6] بھی، وہ پیدا کرنے والے بھی ہیں حتیٰ کہ وہ خود خدا ہیں۔

اور اگر کسی طبقے نے خدا نہیں مانا تو خدا کا بیٹا مانا اور بیٹا سر اور راز
ہوتا ہے باپ کا، جو باپ کی خصوصیات ہیں وہ بیٹے میں ہوتی ہیں تو

---

[1] تعلیم دینے والا [2] اخلاق سدھارنے والا [3] مددگار
[4] عرب کا وہ علاقہ جس میں مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور طائف وغیرہ شامل ہیں
[5] کثرت، زیادتی [6] یعنی خدائی طاقتیں رکھتے ہیں۔

کسی نے ان کو اللہ کہا، کسی نے ثالث ثلاثہ[1] کہا، کسی نے ابن اللہ[2] کہا۔
تو خالق کی خصوصیات مخلوق میں مان رکھی تھیں۔ اور مخلوق کی ذلیل خصوصیات کو بعض قوموں نے خالق میں تسلیم کر رکھا تھا۔

آج بھی تورات میں لکھا ہوا موجود ہے کہ اللہ میاں کی کشتی اسرائیل[3] سے ہو پڑی تو اسرائیل نے اللہ میاں کو پچھاڑ دیا اور غالب آ گئے تو عجز[4] و ضعف[5] اور درماندگی[6] جو مخلوق کی صفات ہیں وہ خالق میں مان رکھی تھیں۔

آج بھی تورات میں یہ آیت موجود ہے کہ جب طوفان نوح آیا تو اللہ میاں کو اتنا صدمہ ہوا کہ اور تو کچھ نہ کر سکے، رو پڑے اور اتنا روئے کہ آنکھیں دکھنے کو آ گئیں اور فرشتے عیادت[7] کے لیے گئے کہ اب مزاج کیسا ہے۔

تو جو مخلوق کی عاجزانہ خصوصیات تھیں وہ خالق میں مان لیں اور جو خالق الٰہی کی خصوصیات تھیں وہ مخلوق میں مان لیں۔ کوئی کہتا تھا کہ ملائکہ علیہم السلام، اللہ کی بیٹیاں ہیں، کوئی کہتا تھا کہ عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ کوئی کہتا تھا کہ ہم سب خدا کے بھائی بھتیجے ہیں، ہم نہ جہنم میں جا سکتے ہیں نہ ہمارا کوئی کچھ بگاڑ سکتا ہے۔

لن یدخل الجنۃ الا
یہود و نصاریٰ میں سے کوئی بھی

[1] یعنی علیٰ تین خداؤں میں سے تیسرے ہیں [2] اللہ کا بیٹا [3] حضرت یعقوب علیہ السلام [4] عاجزی [5] کمزوری [6] مجبوری [7] بیمار پرسی۔

من کان ھودا او نصاریٰ
ہرگز جہنم میں داخل نہیں ہو سکتا
ہم جنت کے ٹھیکیدار ہیں اور ہمارا مقام خصوصی ہے۔ دوسری کوئی قوم نہیں جائے گی صرف ہم جائیں گے۔

تو بہر حال خدا پر دعویٰ کرنے، خدا پر افتراء[1] کرنے اور اللہ اور مخلوق کا فرق اٹھا دینے جیسی ظلمات[2] اور مظالم[3] میں مخلوق پڑی ہوئی تھی، جہالت بھی انتہا کو پہنچ گئی تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جب کہ پورے عالم میں ظلمت[4] تھی۔ خود حدیث شریف میں ارشاد فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ:-

ان اللہ نظر الی قلوب اھل الارض فمقت عربہم وعجمہم
اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کے دلوں کی طرف نگاہ کی فمقت عربہم وعجمہم تو عرب اور عجم سب کو غضب اور قہر کی نگاہ سے دیکھا کیونکہ قلوب میں خیر نہیں رہ گئی تھی الا بقایا من اھل الکتاب مگر چند اہل کتاب جو اپنے دین کو بچائے ہوئے پہاڑوں کی گھاٹیوں میں چھپے ہوئے پڑے تھے۔ جنگلوں اور ویرانوں میں جا کر اپنے دین کی حفاظت کر رہے تھے، آبادیوں اور بستیوں میں کوئی ان کا پرسان حال نہیں رہا تھا، ہر طرف جہل اور ظلم کا دور دورہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ نے اپنی تعلیم اور تربیت سے ان صلاحیتوں کو جگا دیا جو ان جاہل

[1] بہتان تہمت [2] اندھیروں [3] بے انصافیوں [4] اندھیرا اور تاریکی

وظالم انسانوں میں رکھی ہوئی تھیں اور وہی استعداد تھی۔
تو وہی لوگ کہ جو ظلم اور جہل میں مبتلا تھے آپ کی تربیت کے نو
سے منور ہوئے اور دنیا سے بڑھ کر عالم بنے ، دنیا سے بڑھ کر عادل
دنیا سے بڑھ کر با اخلاق بنے ، کل تک ان کا نام مشرکین مکہ اور جہلاء
عرب تھا ، اب ان کا نام صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین) ہوگیا ، کل تک
اس زمانہ کا نام زمانۂ جاہلیت تھا۔ اب اس کا نام ہوا خیر القرون
قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم ، تو دلو
اور روحوں کو پلٹ ڈالا۔
غرض پہاڑوں کو ، لوہے کو موم بنانا آسان ہے مگر مخلوق کے قلو
کو یکسر[1] بدل دینا اور ان میں انقلاب پیدا کر دینا بڑا مشکل ہے۔
تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ آپ
عرب کی دنیا کو پلٹ کر رکھ دیا۔ تیئیس چوبیس سال کے عرصے کے ا
اندر۔ جن کے دلوں میں جہل تھا ان میں علم بھر گیا ، جن کے دلوں میں ظ
و عدوان[4] بھرا ہوا تھا ، ان میں عدل اور انصاف بھر گیا ، جن کے د
میں جفاکاری[5] اور قساوت[6] بھری ہوئی تھی ان میں عالم گیر اخوت[7] پی
کر دی ، جو اقوام کی نگاہوں میں بالکل ذلیل تھے ، ان کو با اقتدار[8] بنا

---

۱ سب زمانوں سے بہتر زمانہ ۲ دلوں ۳ بالکل ۴ ظلم و ستم ۵ سخ
کرنا ۶ بے رحمی ۷ بھائی چارہ ۸ حاکم۔

ان کے سامنے تخت پیش کر دیئے ، تاج پیش کر دیئے اور پھر بھی
ان کی یہ کیفیت تھی کہ جو لوگ ایک ایک پیسہ کے لیے دوسروں کی
جان لینے میں کوئی دریغ نہیں کرتے تھے ، ان کے سامنے خزانے
موجود تھے مگر ان کے زہد[2] و تقویٰ میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا تھا۔
حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیت المال میں تشریف لے گئے تو
سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور چمک رہے تھے تو
فرمایا کہ یا دنیا غرّی غیری۔ اے دنیا دھوکہ کسی اور کو دینا ہم تیرے
فریب میں آنے والے نہیں۔ اور حکم دیا کہ خرچ کیا جائے تو لاکھوں
روپیہ دن بھر کے اندر اندر غریبوں ، یتیموں اور حاجت مندوں کو
تقسیم ہوا۔
حضرت جابر ابن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ، لکھ پتی لوگوں میں
ہیں۔ ایک دن گھر میں تشریف لائے ، اُداس تھے۔ بیوی نے کہا کہ آج
آپ اُداس ہیں ، چہرے پر انقباض[3] اور تکدّر ہے ، کیا بات ہے؟
فرمایا کہ خزانے میں روپیہ زیادہ جمع ہوگیا ہے۔ جب سے میرے دل
پر بوجھ پڑ رہا ہے اور پریشانی ہو رہی ہے۔ وہ بھی صحابیہ تھیں۔ انہوں
نے کہا کہ پھر غربا کو تقسیم کر دو۔ تو ایک دم چونک کر کہا کہ واقعی کیسی
اچھی بات بتائی۔ میرے ذہن میں ہی نہیں آتی تھی۔

---

۱ افسوس ۲ پرہیزگاری ۳ پریشانی ۴ کنجوسی

چنانچہ اسی وقت خزانچی کو حکم دیا کہ تقسیم کر دو، رات بھر روپیہ تقسیم ہوتا رہا، غریبوں کو، بیواؤں کو، یتیموں کو۔ غرض مدینے کی گلی گلی میں روپیہ پہنچا۔ صبح کو جو حساب لگایا تو چھ لاکھ روپیہ رات بھر کے اندر اندر تقسیم ہوا۔ صبح کو آکر بیوی کا شکریہ ادا کیا کہ کیسا نیک مشورہ دیا تھا۔ میرا دل ہلکا ہو گیا۔

توہمارے پاس پیسہ نہ رہے تب ہمارے دل پہ بوجھ پڑتا ہے، وہاں پیسہ بڑھ گیا تب ان کے دل پہ بوجھ پڑا۔ یہ حضورؐ کی تعلیم و تربیت کا اثر تھا۔ خلقی طور پہ تو وہی بخل[1] اور قبض کا مادہ ہے۔ مگر اس کو تعلیم و تربیت سے نکال پھینکا اور اس درجہ اس میں غنا[2] و استغنیٰ[3] اور ایثار[4] پیدا کر دیا کہ دنیا کی قومیں اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتیں۔ اس جہالت میں علم کا بھرنا حضورؐ ہی کی تعلیم و تربیت کا اثر تھا۔

حضرت سعد ابن عمیرؓ رضی اللہ عنہ بیت المقدس اور فلسطین کے والی بنائے گئے تھے اور ایک عرصے تک بنے رہے پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے گورنروں اور عمال[5] کا امتحان کیا کرتے تھے کہ وہ کہیں ظلم کی طرف تو نہیں جا رہے ہیں کہیں ان سے عدل و انصاف کی ٹیا[6] چھوٹ تو نہیں گئی۔ دوسرے آدمیوں کے ذریعے بھی جانچ کراتے تھے اور خود بھی رات کو بھیس بدل

---

۱ کنجوسی ۲ بے نیازی ۳ بے فکری ۴ خود نقصان اٹھا کر دوسرے کو فائدہ دینا ۵ حکام ۶ راستہ، راہ

بدل کر نکلتے تھے کہ مخلوق کی اخلاقی حالت کیسی ہے۔

غرض انہوں نے ایک خادم کو شام بھیجا کہ جا کر ذرا سعد بن عمیر کی خبر لاؤ کہ کس حالت میں ہے اور پانچ سو روپے کی تھیلی دی کہ میری طرف سے ہدیے کے طور پہ پیش بھی کر دینا، مقصد جانچ کرنا تھا۔

خادم پہنچا، حال یہ ہے کہ سعد ابن عمیر فلسطین کے گورنر ہیں اس متمدن ملک کے کہ جہاں دولت اور پھل اور سبزہ زاروں کی کوئی کمی نہیں مگر گورنر صاحب ایک خس پوش[1] کچے سے مکان میں دروازے پہ بیٹھے ہوئے رسیاں بٹ رہے تھے، بان بٹ کے پیٹ پالتے تھے اس سے جو پیسے ملتے تھے ان سے گزر اوقات کرتے تھے۔ بیت المال[2] اور خزانے پہ بار نہیں ڈالتے تھے

غرض خادم پہنچا تو کھڑے ہو گئے، بہت محبت سے ملے، خادم نے حضرت عمرؓ کا پیغام پہنچایا بہت خوش ہوئے۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو گورنر کی جانچ کر رہے تھے کہ گورنر صاحب نے امیر المؤمنین کی جانچ شروع کر دی۔ خادم سے کہا کہ عمر تو بڑا مالدار ہو گیا ہوگا اس واسطے کہ امیر المؤمنین ہے، خزانے اس کے تحت میں ہیں ہزاروں لاکھوں روپیہ جمع کر لیا ہوگا؟ خادم نے کہا کہ نہیں! حضرت عمرؓ کا وہی زہد و قناعت قائم ہے جو زمانہ نبوی کے اندر قائم تھا۔

---

۱ جس مکان کی چھت خشک گھاس کی ہو ۲ سرکاری خزانہ

وُہی جَو کی روٹی، وہی پیوندوں کے کپڑے، وہی زہد، وہی قناعت۔
کہا: الحمدُللہ! خدا نے ہمیں ایسا امیر دیا کہ جو خزانوں پہ قابض ہو کر پھر بھی زاہد اور متقی ہے۔

پھر اس کے بعد سوال کیا کہ حضرت عمرؓ کے ہاں مقدمات تو آتے ہوں گے، خوب جانبداریاں کرتا ہو گا، اپنے رشتہ داروں کی حمایت کرتا ہو گا، دوستوں کو جتاتا ہو گا؟ خادم نے کہا کہ نہیں حضرت عمرؓ غریب کو اور امیر کو ایک نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پبلک کے تمام افراد ان کی نگاہ میں یکساں ہیں۔ وہ عدل و انصاف سے کام کرتے ہیں کہا: الحمدللہ! خدا نے ہمیں ایسا امیر دیا جو عادل بھی ہے منصف بھی ہے۔ کامل بھی ہے۔ غرض وہ تو جانچ کر رہا ہے امیرالمؤمنین کی طرف سے گورنر کی اور گورنر جانچ کر رہے ہیں امیرالمؤمنین کی کہ ان میں تو کوئی فرق نہیں آیا۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو خادم نے پانچ سو روپے کی تھیلی پیش کی کہ حضرت عمرؓ نے بطور ہدیہ کے دی ہے۔

بس یہ دیکھتے ہی غصے سے چہرہ سُرخ ہو گیا اور فرمایا کہ یہ مال عمرؓ کے باپ کا ہے جو ہزار ہزار، پانچ پانچ سو تقسیم کرتا ہے، اس کے باپ کا خزانہ ہے؟ کہا نہیں حضرت عمرؓ نے ذاتی طور پہ دیئے ہیں تو کیا اچھا عمرؓ سرمایہ دار بن گیا ہے کہ پانچ پانچ سو اور ہزار ہزار روپیہ ہدیہ کے طور پہ بھیجتا ہے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ط
غرض ہدیہ تو قبول کر لیا مگر اس ہدیہ کا حشر یہ ہوا کہ اپنے بدن سے

چادرہ اٹھائی اور جہاں کوئی غریب گزرا چادرہ میں سے دو تین بالشت کی ایک پٹی پھاڑی اور دس بیس روپیہ اس میں باندھ کر اس کے سامنے پھینک دیئے، کوئی یتیم گزرا پھر ایک پٹی پھاڑی دس بیس باندھے اس کے آگے ڈال دیئے، شام تک روپیہ بھی ختم ہو گیا اور گورنر صاحب کی چادرہ بھی ختم ہو گئی۔ اخیر میں بیوی نے کہا میرے ہاں کئی دن سے فاقہ ہے کچھ مجھے بھی دیدو تو خفا ہو کے دو تین درہم پھینک دیئے کہ تو بھی اگر اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرنا چاہتی ہے تو بھر لے تجھے مبارک ہو۔ تو یہ کیفیت تھی۔

اس کے بعد خادم نے پیغام دیا کہ حضرت عمرؓ کا جی چاہتا ہے کہ آپ سے ملاقات کریں۔ آپ کو بلایا ہے۔ فرمایا کہ چلو، اسی وقت لاٹھی ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو گئے، اڑھائی سو میل کے سفر کے لیے تیار ہو گئے، نہ اونٹنی، نہ سواری، کہا بس چلو۔ اور پیدل ہی امیرُالمؤمنین کی طرف روانہ ہو گئے۔

حضرت عمرؓ کو اطلاع دے دی گئی کہ فلاں دن پہنچیں گے۔ حضرت عمرؓ شہر سے باہر استقبال کے لیے باہر تشریف لائے، ملاقات ہوئی تو حضرت عمرؓ نے حضرت سعد بن عمیرؓ کے چہرے پہ غصے کے آثار دیکھے۔ بہت حیران ہوئے کہ یہ غصہ کیوں، لیکن سمجھ گئے کہ یہ اس ہدیہ کا اثر ہے۔

حضرت سعدؓ نے کہا کہ شہر میں قیامگاہ پہ بعد میں چلیں گے۔ پہلے

روضۂ اقدس پہ حاضر ہو لیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ پہ سلام عرض کر
لیں - چنانچہ سب تشریف لے گئے۔

روضۂ اقدس پہ حاضر ہو کر حضرت سعد ابن عمیرؓ نے سلام کے
بعد عرض کیا یا رسول اللہ! میں عمرؓ کی منحوس خلافت میں زندہ نہیں
رہنا چاہتا، جو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں آپؐ نے ہمارے ہاتھوں سے
کاٹ دی تھیں عمر پھر دی پہنانا چاہتا ہے اور پانچ پانچ سو روپے
ہدیے کے ہمارے پاس بھیجتا ہے - میں اس منحوس دورِ خلافت
میں زندہ نہیں رہنا چاہتا" انہوں نے رو رو کر یہ دعا کی۔

اب حضرت عمرؓ کی باری آئی - انہوں نے دعا کی یا رسول اللہ میں
اس وقت تک زندہ رہنا چاہتا ہوں جب تک میری حکومت
میں سعد ابن عمیرؓ جیسے افراد موجود ہیں اور جب یہ نہ رہیں تو میں بھی
زندگی نہیں چاہتا - تو مؤرخین لکھتے ہیں کہ چند ہی دن کے بعد سعد
بن عمیرؓ کی وفات ہوئی اور ان کے اس بیس دن کے بعد ہی حضرت
عمرؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آگیا۔

تو دولت پر قابض ہونے کے بعد اور ملکوں پر حکمراں ہونے کے بعد
یہ زہد و قناعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا اثر تھا۔

تو خلقت اور جبلت میں تو وہی بغض اور بخل اور وہی جہل اور ظلم
تھا لیکن آپؐ کی تعلیم نے، آپؐ کی تربیت نے یہ اثر کیا کہ جو ظالم تھے
وہ عادل بن گئے، جو جاہل تھے وہ عالم بن گئے، جو خود غرض تھے وہ ایثار

پیشہ بن گئے - اور ان کا ایثار اس درجہ پہ پہنچا کہ دوسرے کو نفع پہنچانے
کے لیے اپنی جان تک کی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ دوسرے کو تھوڑا
نفع پہنچ جائے، چاہے ہماری جان ختم ہو جائے۔

یرموک کا واقعہ مشہور ہے کہ مجاہدین جہاد کرتے کرتے شہید بھی
ہوئے، ایک صاحب گزرے اور نزع کی کیفیت طاری ہوئی -
اس حالت میں پیاس کا غلبہ ہوتا ہے، گرمی کی شدت ہوتی ہے -
بہرحال جب جان کھنچتی ہے تو اس سے بڑا مجاہدہ کون سا ہو سکتا ہے
اور اس سے بڑا تعب[1] کون سا ہو سکتا ہے، آدمی کو ذرا استفراغ ہو
جائے تو پسینے پسینے ہو جاتا ہے، بخار آ جائے تو پیاس کا غلبہ ہوتا ہے
یہاں ساری حرارت غریزیہ[2] اتر کر منہ کی طرف آ جاتی ہے اور نکلنے والی
ہوتی ہے، تو پیاس کی شدت اور حرارت کا غلبہ تھا۔
زمین پر گرے اور کہا "پانی"۔ پانی کے پلانے والے کٹورے میں پانی
لے کر پہنچے، پانی ہونٹ کو لگایا ہی تھا کہ پاس سے ایک اور آواز آئی
"پانی"؛ تو کہتے ہیں کہ پہلے میرے اس بھائی کو پلاؤ بعد میں میں پیوں
گا۔ شدت کی تو یہ کیفیت ہے مگر ایثار[3] کا یہ عالم ہے کہ دوسرے کی
پیاس بجھانے کو اپنی جان پہ ترجیح دی - وہ صحابی پانی کا پیالہ دوسرے

۱ے تکلیف ۲ے جسم کی اصلی حرارت جس پر انسان کی زندگی کا مدار ہے۔
۳ے خود نقصان اٹھا کر دوسرے کو فائدہ دینا۔

کے پاس لے کر گئے ، ان کے ہونٹوں تک آیا تھا کہ تیسری آواز آئی "پانی" تو کہتے ہیں کہ پہلے اسے پلا دو بعد میں پیوں گا۔ یہ وہاں لے کر گئے تو چوتھی آواز آئی، سات آوازیں اسی طرح سے آئیں ساتویں تک پہنچے مگر وہ شہید ہو چکے تھے ، لوٹ کر آئے کہ چھٹے کو پلاؤں ، وہ بھی شہید ہو چکے تھے ، لوٹ کر آئے کہ پانچویں کو پلاؤں ، وہ بھی شہید ہو چکے تھے ۔ اخیر تک پہنچے تو دوسرے ، تیسرے اور پہلے سب شہادت کا جام نوش فرما چکے تھے ۔ غرض ہر ایک نے اپنی جان دینی گوارا کی ، مگر دوسرے بھائی کی پیاس گوارا نہیں کی۔

یہ ایثار ان لوگوں میں آگیا۔ جو ایک ایک پیسے کے لیے جان لینا اور جان دینا کوئی بات نہیں سمجھتے تھے ۔ ہزاروں کی گردنیں کاٹ دیتے تھے کہ چار پیسے ہمیں مل جائیں ، ڈکیتیاں ڈالنا ، لوٹ مار کرنا ان کا پیشہ تھا۔ مگر آج وہ اس درجہ مستغنی[1] اور اس درجہ ایثار پیشہ بن گئے۔

تو اسی قبض و بخل اور اسی قساوت[2] کے اندر یہ رقت[3] ، یہ علم و فضل اور یہ کمال پیدا کرنے میں ان کی صلاحیتیں تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تھی تو وہ قابل[4] بھی کامل تھے اور فاعل[5] بھی کامل تھے ، قابلیت اعلیٰ تھی ، صلاحیت اعلیٰ تھیں ، فاعل کا فعل جب پہنچا تو جیسی صلاحیتیں تھیں ویسی اجاگر ہو گئیں

---

[1] بے پرواہ [2] بے رحمی [3] نرمی [4] اثر قبول کرنے والا۔
[5] اثر ڈالنے والا

اور اپنے اپنے درجہ پہ اتنے اتنے ہوئے کہ آج تمام اہل سنت والجماعت کا اجتماعی عقیدہ یہ ہے کہ :

الصحابۃ کلہم عدول

سارے کے سارے صحابہ متقین ، پارسا اور پاک باز ہیں اور ان کی نیتیں بخیر ہیں اور پوری امت میں بڑے سے بڑا قطب اور غوث بھی بڑے سے بڑے مقام پہ پہنچ جائے لیکن صحابیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ یہ عقیدہ اہل سنت والجماعت کا ہے ۔

تو یہ وہی صحابہ ہیں کہ نبوت کے دور سے پہلے ان کا نام مشرکین عرب تھا ، جہلائے مکہ تھا۔ اور نبوت کے آنے کے بعد اور تعلیم قبول کرنے کے بعد وہ صحابہ کرام بنے ، علمائے عظام بنے ، عرفائے کرام بنے ، جو اعلیٰ سے اعلیٰ لقب کسی فضل و کمال والے کا ہو سکتا ہے وہ ان کے لیے سب سے پہلے ہے۔ یہ آپ کی تعلیم کا اثر ہے ۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ دنیا ظلمانی ہے اس میں اگر روشنی پیدا کی ہے تو نبوت نے کی ہے ، دنیا کے اندر بداخلاقی اصل ہے ، اس میں اگر نیک اخلاق آئی ہے تو انبیاء کی جوتیوں کے صدقے سے آئی ہے

تو پوری دنیا کی ظلمتوں میں چاندنا نبوت سے ہوا ہے۔ دنیا میں اگر نبوت نہ آئے تو یہ انسانوں کا گلہ ، ڈھوروں اور ڈنگروں کا گلہ ہے جنہیں نہ اخلاق کی خبر ، نہ علم کی خبر۔ اور اب بھی جب نبوت

کے آثار سے انسان کو کچھ بھی بُعد ہوتا ہے وہی اصلی جہالت اور وہی اصلی ظلمت پھر غالب آتی ہے اور جب نبوت کی طرف جھک گئے تو پھر وہی علم وعدل اور معرفت آنی شروع ہو جاتی ہے۔

تو انسان کی خوبی صرف صلاحیت کی ہے اس صلاحیت کو اجاگر کرنے کے لیے انبیاء بھیجے گئے تو نبی آکر دنیا میں دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں۔ ہم حق تعالیٰ کا قانون لے کر آئے ہیں اس دعویٰ کے لیے ضرورت پڑتی ہے دلیل کی۔ اس لیے کہ آنکھوں سے کسی نے دیکھا نہیں کہ نبی کے اوپر قانون اتر رہا ہے، یا نبی صاحبِ علم بنے ہیں، نبی کسی مکتب میں نہیں پڑھتے، کسی مدرسے سے تعلیم نہیں پاتے۔ ایک دم بیک دم یہ دعویٰ کرتے ہیں اور وہ علم پیش کرتے ہیں کہ دنیا کے علماء اور عُرفاء عاجز رہ جاتے ہیں۔

تو اوّل تو یہی خود ایک بڑی دلیل ہے کہ بغیر پڑھے لکھے اس درجہ کے علوم ظاہر کرنا کہ دنیا کے اہلِ علم عاجز ہو جائیں گے بہر حال نبوت کے ثبوت کے لیے دلائل کی ضرورت پڑتی ہے۔

کیونکہ نبوت ایک دعویٰ ہے کہ میں اللہ کی طرف سے آیا ہوں میں قانون لے کر آیا ہوں اور ساتھ میں یہ دعویٰ کہ جو میں کہوں گا وہی حق ہوگا۔ اس کے سوا کوئی چیز حق نہیں ہو سکتی، اور ساتھ ہی یہ دعویٰ کہ جو میں کہوں گا قطعی بات ہوگی اس میں تذبذب[1] کی بھی گنجائش نہیں، اس

---

[1] شک و شبہ

پہ ایمان لانا پڑے گا اور اس درجہ کا ایمان کہ نہ اس میں شک کی گنجائش ہے، نہ تردّد[1] کی گنجائش ہے، نہ تذبذب کی، تو اتنا عظیم دعویٰ کہ میں خدا کی طرف سے آیا ہوں، خدا کی طرف سے کتاب لایا ہوں، خدا کی طرف سے دعویٰ لے کر آیا ہوں، ان دعووں کے دلائل میں انبیاء کو وہ عجیب چیزیں دی جاتی ہیں کہ دنیا میں تمام مخلوق انہیں کر کے نہیں دکھلا سکتی وہ چیزیں نبی کے ہاتھ پہ ظاہر ہوتی ہیں۔ نبی گویا تصرّف[2] کرتے ہیں آسمانی چیزوں میں بھی اور زمینی چیزوں میں بھی علویات[4] میں بھی ان کے اثرات پہنچتے ہیں اور سفلیات[5] میں بھی ان کے اثرات پہنچتے ہیں۔

اسی کو معجزہ کہتے ہیں کہ خرقِ عادت[6] کے طور پہ وہ باتیں دکھلانا کہ دنیا ان کی مثال پیش کرنے اور ان جیسا کام کرنے سے عاجز رہ جائے۔ یہ اس کی دلیل ہوتی ہے کہ بے شک یہ خدا کی طرف سے آیا ہے۔ خدا نے اس کے ہاتھ پہ وہ قوتیں ظاہر کی ہیں کہ جن قوتوں کے ہوتے ہوئے یہی کہا جائے گا کہ یہ فرستادہ[7] خداوندی ہے۔ ذاتی طور پہ کوئی دعویٰ لے کر نہیں آیا، خدا کی طرف سے آیا ہے۔ یہ بطورِ سند[8] کے چیزیں پیش کی جا رہی ہیں۔

---

[1] سوچ و فکر [2] دخل دیتے ہیں [3] کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں [4] عالمِ بالا کی چیزیں [5] زمین کی چیزیں [6] عادت کے خلاف [7] خدا کی طرف سے بھیجا ہوا

[8] نبوت

تو انبیاء کو معجزات دیئے جاتے ہیں، معجزہ خرقِ عادت ہوتا
ہے، عادت کے طور پر جو افعال ہوتے ہیں ان سے بالاتر ہوتا ہے
اس لیے کہ معجزہ درحقیقت خدا کا فعل ہوتا ہے جو ظاہر تو ہوتا ہے
نبی کے ہاتھ پر مگر آتا ہے من اللہ تو بشر اس سے عاجز ہوتا ہے
اس واسطے بشر کو ماننا پڑتا ہے کہ یہ خدائی چیزیں ہیں اور یہ بھی خدا کا
فرستادہ ہے۔ خدا نے اپنے افعال اس کے ساتھ کیے ہیں تو یقیناً
خدا کے اقوال بھی اس کے ساتھ ہیں۔ جب افعال سے مدد کی جا
رہی ہے تو اقوال میں یہ ضرور خدا ہی کی طرف سے نقل کر رہا ہے۔
تو حق تعالیٰ اقوال دیتے ہیں اور نبی کے ساتھ اپنے افعال کرتے
ہیں۔ تاکہ وہ فعل قول کی حقانیت اور صداقت کی دلیل بن جائے
وہ نبی کی صداقت کے لیے ہوتے ہیں اس لیے معجزہ نبوت کی دلیل
ہوتا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کی نار کو گلزار بنا دیا گیا، عادتاً یہ چیز مستبعد ہے
اور ممکن نہیں ہے کہ آگ ٹھنڈک کا کام دے اور بردًا و سلام بن جائے
یقیناً خرقِ عادت ہے۔ جب یہ معجزہ ایک ذات اقدس پر ظاہر ہوا

---

۱ کام ۲ اللہ کی طرف سے
۳ انسان ۴ باتیں ۵ بات ۶ مشکل اور قیاس سے باہر
۷ ٹھنڈی اور آرام دینے والی

یقیناً سمجھنے والوں نے یہ سمجھا کہ یہ خدا کی طرف سے ہے بندوں کے
ہاتھ میں قوت نہیں۔
حضرت صالح علیہ السلام نے پتھر میں سے اونٹنی نکالی وہ چرتی
بھی تھی اور کھاتی بھی تھی، اس کے بچہ بھی ہوا۔ یقیناً عادۃً یہ چیز
مستبعد ہے کہ پتھر کے اندر سے جاندار پیدا ہوا اور جاندار بھی غیر معمولی
کہ قد و قامت بھی اتنا طویل و عریض کہ عام اونٹنیوں کا قد و قامت اتنا
نہیں ہوتا۔ کھانا بھی اس کا ایسا عجیب و غریب کہ چرنے پہ آتی تو ایک
دم سارے کھیت چر گئی، پینے میں آئی تو تالاب خشک کر دیئے۔
یہ ساری چیزیں خوارق تھیں عادت کے مطابق نہیں تھیں۔ ان
افعال کو دیکھ کر دلوں نے یقین کیا کہ یہ بے شک فرستادۂ خدا ہے،
کسی نے مانا اگر دل میں تسلیم و رضا آگئی۔ کسی نے نہ مانا اگر عناد اور جحود
کا جذبہ پیدا ہو گیا مگر یہ ضرور تسلیم کیا کہ یقیناً یہ کوئی غیر معمولی چیز ہے جو خدا
کی طرف سے ہے
تو نارِ خلیل ایک معجزہ ہے۔ ناقۂ صالح ایک معجزہ ہے ید بیضا بھی

---

۱ لمبا چوڑا ۲ دشمنی ۳ انکار ۴ آگ کا وہ ڈھیر جس میں حضرت ابراہیم
کو ڈالا گیا ۵ حضرت صالح کی اونٹنی جو معجزہ کے طور پر پتھر سے نکلی تھی ۶ مراد
حضرت موسیٰ کا ہاتھ

ایک معجزہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ہاتھ گریبان میں ڈالتے ہیں اور جب نکالتے ہیں تو سورج کی طرح روشنی پڑ رہی ہے۔

عادۃً یہ چیز بعید ہے کہ کوئی شخص گریبان میں ہاتھ ڈالے اور نکلے تو وہ سورج بن جائے۔

عصا[1] موسیٰ یقیناً معجزہ ہے کہ اس کو پتھر پہ مارتے ہیں تو بارہ چشمے بہہ پڑتے ہیں۔ بہتے ہوئے پانی پہ مارتے ہیں تو وہ پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے اور بارہ راستے بن جاتے ہیں تو جامد[2] کو سیال[3] بنا دیا اور سیال کو جامد یعنی انقلابِ[4] ماہیت پیدا کر دینا یقیناً خرقِ عادت ہے عادۃً یہ چیز مستبعد ہے کہ دریا کا پانی خود بخود رک جائے، راستے بن جائیں۔ یا ایک لاٹھی مارنے سے پتھر سے چشمے بہہ پڑیں، خود لاٹھی معجزہ ہے کہ ہاتھ میں اسے رکھو تو لاٹھی ہے اور کسی چیز پہ مار دیا پھینک دو تو اژدہا[5] بن کر لہرانے اور پھنکارنے لگے۔ یہ یقیناً معجزہ ہے۔ عادۃً یہ چیز نہیں ہوتی کہ لاٹھی ہاتھ میں لو تو لاٹھی اور پھینکو تو وہ اژدہا بن جائے اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو احیائے[6] موتیٰ اور ابرائے اکمہ وابرص[7] یہ معجزات دیئے گئے۔

تو تمام انبیاء علیہم السلام کو کچھ سندیں ایسی دی گئیں کہ جن سندوں

---

[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی لاٹھی [2] جا ہوا پتھر کی طرح [3] جاری ہونے والا بہنے والا [4] کسی چیز کی حقیقت کو ہی بدل دینا [5] بہت بڑا سانپ [6] مردوں کا زندہ ہو جانا [7] پیدائشی اندھوں کا بینا ہو جانا [7] کوڑھیوں کا اچھا ہو جانا

کے ذریعے سے لوگ باور[1] کر سکیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہے، اور جو کچھ یہ قول سے کہہ رہا ہے جب کہ یہ فعل اس کے ساتھ ہیں تو یقیناً یہ قول بھی خدا ہی کا ہے جس کو یہ نقل کر رہا ہے۔

تو جیسے افعال کے حق میں وہ مظہر[2] ہے کہ کارفرمائیاں قدرت کی ظاہر ہو رہی ہیں اور جائے[3] ظہور بنا ہوا ہے نبی کا بدن۔ اسی طرح سے یقیناً جو یہ کلام کر رہا ہے اس میں زبان اگرچہ اس کی ہے مگر قول خدا کا ہے۔

وما ینطق عن الهوی ان هو الا وحی یوحیٰ۔

یہ نبی کا قول نبی کی ذات کا قول نہیں ہے خدا کا قول ہے۔ جو اس کی زبان سے ظاہر ہو رہا ہے

تو چاہے ہاتھ پہ معجزہ ظاہر ہو یا زبان پہ کلام ظاہر ہو، کلام کی حقانیت[4] کے لیے معجزہ دلیل ہوتا ہے۔

تو نبوت درحقیقت ایک دعویٰ ہے، اور معجزات اس کے لیے بمنزلِ دلیل کے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک انعام فضل اور فرقِ مراتب ہے کہ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو عملی معجزے دیئے گئے جیسے ابراہیم علیہ السلام کو نار دی گئی، نار گلزار بن گئی، صالح علیہ السلام نے اونٹنی نکال دی، موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ کو روشن کر کے دکھلا دیا، لاٹھی کو عصا، عصا کو اژدہا

---

[1] یقین [2] ظاہر کرنے والا [3] ظاہر ہونے کی جگہ۔ [4] سچائی۔

بنا دیا۔

یہ تمام معجزات فعلی اور عملی معجزات ہیں اور یہ ظاہر بات ہے کہ عمل[1] عامل[2] کی ذات کے ساتھ رخصت ہو جاتا ہے۔ اگر عامل دنیا میں نہ رہے تو اس کا عمل بھی باقی نہیں رہتا بلکہ اس کے ساتھ چلا جاتا ہے۔

تو جتنے انبیاء کو معجزات دیئے گئے جب وہ انبیاء دنیا سے رخصت ہوئے ان کے معجزات بھی رخصت ہو گئے، آج گلزارِ[3] خلیل کا کہیں نشان نہیں، آج عصائے موسیٰ موجود نہیں، آج احیائے موتیٰ موجود نہیں۔ سب معجزات ختم ہو گئے۔ اس لیے کہ صاحبِ معجزہ یہاں نہیں ہیں۔ تو عمل عامل کی ذات کے ساتھ رخصت ہو جاتا ہے۔ تو عملی معجزات بھی ان عاملین حضرات کے دنیا سے جانے کے بعد چلے گئے۔ لیکن علم کی شان یہ ہے کہ عالم کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد علم رخصت نہیں ہوتا وہ باقی رہتا ہے۔

اس واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں ہزاروں معجزات عملی دیئے گئے وہاں سب سے بڑا معجزہ علمی دیا گیا جو قرآن کریم ہے کہ آپ دنیا سے رخصت ہو جائیں، تب بھی وہ معجزہ باقی رہے اور جیسے میں نے عرض کیا کہ معجزہ دلیل ہوتا ہے نبوت کی۔ تو آج جب نبوت کی دلیل موجود ہے وہ نبوت بھی موجود ہے۔ جن نبوتوں کے دلائل ختم ہو چکے وہ نبوتیں بھی ختم

[1] کام [2] کام کرنے والا۔ [3] مراد آگ جو بطور معجزہ کے گلزار بن گئی تھی

ہو چکیں۔ تو آج کی نبوت وہ ہے جو قیامت تک باقی رہے گی۔ جب تک قرآن باقی ہے دلیل موجود ہے اس لیے نبوت بھی موجود ہے۔ اور دعویٰ قیامت تک کا ہے کیونکہ دلیل قیامت تک کی ہے۔

تو حضورؐ نے عملی معجزات بھی دکھلائے اور ان سے بڑھ چڑھ کر دکھلائے جو انبیاء سابقین کو دیئے گئے۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام نے احیائے موتیٰ کا معجزہ دکھلایا کہ مُردے ہوئے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احیائے[1] استوانہ کا معجزہ دکھلایا

حدیث میں واقعہ آتا ہے کہ کھجور کا ایک گز ڈیڑھ گز کا خشک تنا مسجد نبوی میں کھڑا ہوا تھا اوپر سے اسے کاٹ دیا گیا تھا اور اس پہ ٹیک لگا کر آپ خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ جب منبر بنا دیا گیا اور اس پر خطبہ ارشاد کرنے کے لیے تشریف لے گئے تو حدیث میں ہے کہ اس خشک تنے میں سے فریاد[2] و بکا اور گریہ وزاری کی ایسی آوازیں آئیں جیسے بچے بلک بلک کر روتے ہیں۔ آپؐ کو منبر سے اترنا پڑا، آپؐ نے اس پہ ہاتھ رکھا جیسے کوئی تسلی اور دلاسا دیتا ہے، تب جا کر وہ ستون بلک بلک کر چپ ہوا۔

کتنا بڑا فرق ہے اگر عیسیٰ علیہ السلام نے مُردے کو زندہ کیا تو وہ انسانی مُردہ تھا۔ جو زندہ ہوا، اس بدن سے اس کی روح کو یقیناً مناسبت تھی

[1] لکڑی کے ستون کا زندہ ہونا [2] رونا اور فریاد کرنا۔

روح اس میں پہلے موجود تھی جو نکل گئی تھی، تو نکلی ہوئی چیز کو اگر بعد میں
پہنچا دیا جائے تو وہ اپنے محل میں پہنچی، کوئی عجیب بات نہ ہوئی۔ انسان
اگر زندہ ہو کر انسانی حرکتیں کرنے لگے تو کوئی بعید بات نہیں کیونکہ انسانی
جسم کا بھی یہی تقاضا ہے اور انسانی روح کا بھی یہی تقاضا ہے۔ تو آدمی کے
بدن میں آدمی کی روح آجائے اور وہ آدمیوں کے سے افعال انجام دینے
لگے تو زیادہ تعجب کی بات نہیں لیکن کھجور کے خشک تنے کو زندہ کیا جائے
اور زندگی میں روح وہ آجائے کہ فراقِ نبوی میں رونے لگے یعنی فقط
انسانوں جیسی روح نہیں بلکہ عشاقِ صادقین کی روح جو اہل اللہ اور عارفین
کو نصیب ہوتی ہے کہ فراقِ نبوی برداشت نہ ہو، حضورؐ کے فراق میں
گریہ و بکا کرے ایسی روح دی گئی۔

تو کہاں کھجور کا تنہ اور کہاں اہل اللہ اور کاملین کی روح جس جسم میں ڈالی
جائے وہ زندہ ہو جائے، تو انسان کے بدن میں اگر انسانی روح آجائے
تو تعجب کی بات نہیں لیکن کھجور کے تنے میں انسانی روح آئے، انسانوں
میں بھی کامل انسان کی روح آئے یہ اس سے بڑھ چڑھ کر معجزہ ہے جو آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔

اسی طرح آپ کو معجزہ شق القمر دیا گیا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے
معراج کا دیا گیا کہ منٹوں میں اور پل بھر میں دنیا اور زمین اور فضا اور آسمان
کو طے کر کے آپ مستوی[1] تک پہنچ گئے۔ جنتوں تک کی سیر کی۔ یہ

[1] منزل مقصود۔ اسم ظرف از استوی الی الشیء۔

معجزات دیئے گئے جو نبوت کی دلیل ہیں۔ رات کے تھوڑے سے
حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک پہنچے، جو اڑھائی سو تین سو میل کا
فاصلہ ہے یہ "اسریٰ" کہلاتا ہے اور پھر وہاں سے عروج[1] ہوا۔ تو آپ
نے سمٰوات سبع[2] کا سفر کیا۔ یہ معجزہ دیا گیا۔ اسی طرح سے اور ہزاروں معجزات
ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائے گئے۔

تو معجزہ دلیل ہے نبوت کی، جب آپ نے معجزے پیش کیے اور معجزہ
دلیل ہے نبوت کی تو گویا نبوت ثابت ہوئی۔ تو معجزات اصل میں مسائل
کی دلیل نہیں ہوتے، قانون کے لیے دلیل نہیں ہوتے۔ قانون کے حق ہونے
کی دلیل تو نبی کی ذات ہوتی ہے کہ نبی سچ کے سوا غلط کبھی نہیں کہہ سکتا،
قانون حق ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی نے کہا اور نبی حق پر ہے اس کی
دلیل معجزہ ہے۔

تو معجزہ نبوت کی دلیل ہوتی ہے قانون کی دلیل نہیں ہوتی۔ اگر
مثلاً ہم یوں کہیں کہ نماز ظہر کی چار رکعتیں فرض ہیں۔ اور آپ ہم سے
دلیل مانگیں اور ہم دلیل یہ دیں کہ حضور نے چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے
تھے۔ تو چاند کے دو ٹکڑے ہو جانے سے یہ کیسے لازم آیا، کیا ضروری
ہے کہ چار ہی رکعت ہونی چاہئیں، دو کیوں نہ ہو جائیں۔

تو معجزہ احکام کی دلیل نہیں ہوتی۔

[1] اوپر جانا [2] ساتوں آسمان

روزہ فرض ہے۔ ہم سے کوئی دلیل مانگے کہ کیوں فرض ہے۔ ہم کہیں کہ حضورؐ معراج میں گئے تھے۔ اس لیے فرض ہے تو پوچھنے والا پوچھے گا کہ معراج کو روزے سے کیا تعلق۔ معراج اگر ثابت ہو جائے تو تیس دن کے روزوں کا ہونا کیسے ضروری نکلا۔ روزے دس دن کے کیوں نہیں ہو گئے؟ دو مہینے کے کیوں نہیں ہو گئے؟

تو روزہ اور نماز اور احکامِ شرعیہ کے دلائل معجزات نہیں ہوتے معجزہ دلیل ہوتی ہے نبی کے حق ہونے کی۔ اور نبی کی ذات دلیل ہوتی ہے احکام کے حق ہونے کی۔ اس لیے احکام کو ذات کی حقانیت[1] سے پہچانا جائے گا اور ذات کی حقانیت معجزات سے پہچانی جائے گی۔

بہرحال معجزہ نبوت کی دلیل ہے مگر معجزہ ہوتا ہے خرقِ عادت[2]، جب لوگ عادت کے بندے بن جاتے ہیں اور عبد المسبب[3] الاسباب ہونے کی بجائے عبد الاسباب[4] بن جائیں تو وہ ہر چیز میں اسباب کی تلاش کرتے ہیں اور معجزہ ان کے دماغ میں نہیں بیٹھتا جب کہا جاتا ہے کہ حضورؐ معراج میں گئے تو وہ حیران ہوتے ہیں کہ بھلا آدمی کیسے جا سکتا ہے۔

---

[1] سچائی [2] عادت اور عام طریقہ کے خلاف [3] اسباب پیدا کرنے والے کا بندہ [4] خدا پر نگاہ رکھنے کی بجائے اسباب پر نگاہ رکھنے والا۔

کہا جائے کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ انبیاءؑ کے لیے طیِ زمان[1] اور طیِ مکان ہوتا ہے کہ لمبی سے لمبی مسافت پر پل بھر میں پہنچ جاتے ہیں، یا بڑے سے کام کو جو پچاسوں گھنٹوں میں ہونا ہو وہ دو منٹ میں کر لیتے ہیں اور ان کے لیے زمانہ بھی لپیٹ جاتا ہے اور مکان بھی لپیٹ جاتا ہے تو رات دن اسباب میں گھرے ہوئے ہیں، ان کے دماغ میں نہیں بیٹھتا کہ یہ چیز کیسے ہو سکتی ہے۔

اس لیے حق تعالیٰ شانہٗ نے اس امت میں کچھ ایسے افراد پیدا کیے کہ چاہے وہ اسلام لائیں یا نہ لائیں مگر ایسی ایجادات[2] کریں، ایسی تیاریاں کریں کہ ہر معجزے کے لیے مادیات[3] میں ایک مثال بن جائے اور ان کا منہ بند کیا جا سکے۔

کل تک یہ کہا جا سکتا تھا کہ آسمانوں کی طرف عروج[4] ناممکن اور محال ہے۔ فلاسفۂ قدیم تو کہتے تھے کہ بیچ میں کرۂ نار[5] پڑتا ہے بھلا آدمی کیسے گزر جائے گا پھر بیچ میں ہی کرہ ہوا پڑتا ہے، انسان تھوڑی ہوا برداشت نہیں کر سکتا۔ ہوا کے ذخیرے میں پہنچ جائے تو ہوا اسے کیسے چھوڑے گی۔

---

[1] طی کے معنی ہیں لپیٹنا۔ طی زماں، طی مکاں، طی ارض، سب کا مطلب ہے کہ جو کام یا سفر مہینوں اور سالوں میں ہو سکنے والا ہو اس کو منٹوں سکنڈوں میں کر لینا [2] نئی نئی چیزیں پیدا [3] مطلب محسوس ہونے والی چیزیں [4] اوپر جانا۔ [5] آگ کا کرہ

غرض یہ محال سمجھا جاتا تھا آج جب ایجادات ہوئیں اور جیٹ طیارے
تیار ہوئے اور لوگ سیاروں میں بیٹھ کر چلے اور دنیا کے چکر کاٹنے شروع
کیے اور انہوں نے ارادے یہ باندھے کہ ہم چاند تک پہنچیں گے تو کم سے
کم یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ سرعتِ سیر کے لیے کوئی مقدار معین نہیں۔ جلدی
سے جلدی پہنچنے کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے، مہینے بھر کی مسافت
آدمی گھنٹوں میں بھی طے کر سکتا ہے۔ گھنٹوں کی مسافت منٹوں میں طے
کر سکتا ہے۔ منٹوں کی مسافت سکنڈوں میں طے کر سکتا ہے۔ یہ قدیم فلاسفہ
کا بھی مذہب ہے کہ سرعتِ سیر کے لیے کوئی حد مقرر نہیں۔ بڑی سے
بڑی سیر چھوٹی سے چھوٹی مدت میں ہو سکتی ہے۔

اور آج کے فلسفے نے اس کا مشاہدہ کرا دیا کہ جس چیز کو آج سے پچاس
برس پہلے لوگ محال کہتے تھے آج وہ ممکن بن گیا، کل اگر کوئی یوں کہتا کہ
پچاس برس پہلے میں نے ایسی سواری ایجاد کی ہے کہ اس میں بیٹھ کر میں
دنیا کا چکر لگا سکتا ہوں۔ پوری دنیا میں گھوم سکتا ہوں تو لوگ اُسے
دیوانہ کہتے کہ یہ عقل میں آنے والی بات نہیں! لیکن جب گاگرین چلا
اور اس نے (تقریباً ۲۵ گھنٹوں میں سترہ) چکر دنیا کے لگائے تو اب
سب کے منہ بند ہیں۔

اس کا حاصل۲؎ یہ ہے کہ وہی بات اگر پیغمبر کہے تو ہم ماننے کے لیے

۱؎ تیز رفتار ۲؎ مطلب۔

تیار نہیں اور اگر وہی بات پیغمبروں کے منکر کہیں تو ہم ماننے کے لیے
تیار ہیں یعنی فرق اسباب۱؎ اور مسبب۲؎ الاسباب کا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے کہو تو ماننے کی بات نہیں لیکن
اگر دنیا کی طرف منسوب کر کے کہو تو ماننے کی بات ہے۔ تو جب اللہ
تعالیٰ نے دیکھا کہ یہ بغیر دیکھے ماننے کے لیے تیار نہیں تو دنیا میں ایسے
اسباب مہیا کر دیئے کہ وہ معنویات۳؎ کے ماننے کے لیے مثال بن جائیں۔

تو حق تعالیٰ نے مسلمانوں سے کہا کہ تم دعویٰ کرو اور دنیا کے موجودہ
فلاسفروں سے کہا کہ تم ان کے لیے دلائل مہیا کرو۔ اگر دونوں کام
مسلمانوں کے ذمہ ڈال دیتے کہ یہی معراج کا دعویٰ کرتے اور یہی ایجادیں
کر کے اسے ثابت کرتے تو علمی ترقی نہ ہو سکتی بلکہ یہ محض صناع۴؎ اور دستکار
بن کے رہ جاتے۔

تو اللہ نے ان سے کہا تم علمی دعویٰ کرو اور دوسری قوم کو کہا کہ
تم عملی دلائل مہیا کرو۔ یہ دعویٰ کریں تم اس کو ثابت کرو، کل کو ممکن ہے
اسی اثبات کی بدولت تم بھی ان دعووں کو ماننے لگو۔

آج کم سے کم معراج سے انکار کرنے کا کوئی حق باقی نہیں رہا۔ کیونکہ
چاند میں جانے کا جب ارادہ کر لیا تو پہنچنا نہ پہنچنا تو بعد کی بات ہے

۱؎ جمع سبب ۲؎ سبب پیدا کرنے والا یعنی اللہ تعالیٰ ۳؎ باطنی چیزیں
۴؎ بڑا کاریگر بڑا ہنرمند

صرف ارادہ کرنے ہی سے امکان[1] تو ثابت ہو گیا۔ وقوع جب بھی
ہو وہ ہوتا رہے گا۔

تو کل تک جو لوگ معراج کے سفر کو ناممکن کہتے تھے کم سے کم ان
کے منہ پہ مُہر لگ گئی اور وہ اب نہیں بول سکتے۔ اس واسطے کہ وہ
امکان کے قائل ہو گئے۔ کیونکہ سب سے بڑی چیز تو امکان ہی ہے
واقعہ ہونا تو امکان کے آثار[2] میں سے ہے وہ جب بھی ہو جائے۔

معتزلہ کا دور تھا جو مسلمانوں کا ایک فرقہ ہے ان کا یہ دعویٰ ہے کہ
حق تعالیٰ شانہٗ کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ نہ دنیا میں کوئی دیکھ سکتا ہے۔ نہ آخرت
میں کوئی دیکھ سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دیدارِ خداوندی محال اور ممتنع[3] ہے
عقلاً اور شرعاً ناممکن ہے۔

غرض یہ ان کا دعویٰ ہے۔ اس کے مقابلے میں اہل سنت والجماعت
اور اہل حق کا دعویٰ یہ ہے کہ آخرت میں اللہ کے بندے اللہ کو دیکھیں
گے۔ انہیں دیدارِ خداوندی نصیب ہوگا۔ عرصاتِ قیامت[4] میں اور
جنت میں بھی ہوگا۔ غرض ہر جگہ حق تعالیٰ کا دیدار اور تجلیات ان کے
سامنے آئیں گی۔ اور وہ انہیں دیکھیں گے۔

قرآنِ کریم نے فرمایا کہ:۔

---

۱ کسی چیز کا ہو سکنا ۲ اثر کی جمع یعنی نتیجہ ۳ نہیں ہو سکتا۔
۴ قیامت کا میدان۔

وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربہا ناظرۃ ط

بہت سے چہرے ہوں گے جو چمکے ہوئے ہوں گے، تر و تازہ
ہوں گے چودھویں رات کے چاند کی طرح چمک رہے ہوں گے
اور اپنے پروردگار کی طرف نگاہیں لگا کر اس کو دیکھ رہے ہوں گے۔

کفار کے بارے میں فرمایا کہ:۔

کلا انہم عن ربہم یومئذ لمحجوبون ط

یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور ہوگا کہ کفار قیامت میں وہ محجوب[1] ہوں
گے۔ ان کے لیے حجاب[2] حائل کر دیا جائے گا وہ اس لذتِ دیدار
سے دوامی[3] طور پہ محروم کر دیئے جائیں گے۔

تو ان کو مایوس کیا گیا اور مومن کو امیدوار بنایا گیا۔ حدیث میں
ہے کہ بعض صحابہ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ اربوں
کھربوں مخلوق یعنی آدم کی ساری اولاد جب ایک جگہ جمع ہوگی تو بڑا
ہجوم اور جمگھٹا ہوگا۔ دس بیس پچاس ہزار آدمی جمع ہو جاتے ہیں تو بھیڑ
ہو جاتی ہے، چیخ دپکار ہوتی ہے اور سب ایک دوسرے کے لیے حجاب
اور آڑ بن جاتے ہیں تو یہ اتنی مخلوق کہ سارا آلِ حضرت آدمؑ کا ایک جگہ جمع
ہو ایک وقت میں کیسے اللہ میاں کو دیکھ لے گا۔

آپؐ نے فرمایا کہ جب چودھویں رات کا چاند چمکتا ہوا ہوتا ہے تو ساری

---

۱ پردہ ڈالا ہوا ۲ پردہ ۳ ہمیشہ کے لیے

دنیا کے انسان کیا ایک وقت میں اس کو نہیں دیکھتے؟ کیا ایک کے دیکھنے میں دوسرے کا دیکھنا حجاب بن جاتا ہے؟ تو جب ایک وقت میں سب چمکتے ہوئے چاند کو دیکھ سکتے ہیں تو اسی طرح سے جنتوں میں اور عرصاتِ قیامت میں سارے بنی آدم[1] مل کر ایک وقت میں اللہ کا دیدار بھی کر سکتے ہیں۔

تو بہرحال دیدارِ خداوندی ممکن بھی ہے، واقع بھی ہوگا اور حق ہے، یہی مذہب اہلِ حق کا ہے جسے انبیاء لے کر آئے۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ محال اور ناممکن ہے کہ اللہ کو کوئی دیکھ سکے انہوں نے اس دعویٰ کو اٹھایا اور دلائل پیش کئے چونکہ یہ دعویٰ اسباب کے ذرا مطابق ہے کہ اللہ میاں کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس لیے عوام مبتلا ہونے شروع ہوئے اور بہت سوں کے ایمانوں میں کچھ خلل پڑنا شروع ہوا چنانچہ علماء نے بحثیں کیں، مناظرے کئے، تقریریں کیں مگر چونکہ علماء باریک بات کہتے تھے جو معقولیت سے بھرپور ہوتی تھی اور وہ منکر[2] تھے۔ انکار کرنے والا شبہ ڈال دے تو جلدی اثر ہوتا ہے اور حقیقت دل میں ذرا دیر سے بیٹھتی ہے اس لیے منکرین جلد کامیاب ہوتے ہیں اور مقرین[3] دیر سے کامیاب ہوتے ہیں۔ مقر کو ثابت کرنا پڑتا ہے اور دلائل دینے پڑتے ہیں جبکہ منکر ایک شبہ پیدا کر کے پلک میں

---

[1] اولادِ آدم [2] انکار کرنے والے [3] ماننے والے۔

پھیلا دیتا ہے اور سب کے سب اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تو شبہ جہالت کی چیز ہے اور اس کے خلاف ثابت کرنا علم کی چیز ہے، اس لیے جاہل دنیا میں جلد غالب آ جاتا ہے اور عالم دیر سے، اس لیے کہ اسے بڑے مقدمات طے کرنے پڑتے ہیں جبکہ جاہل کو ایک انکار کافی ہو جاتا ہے۔

تو معتزلہ نے جب یہ کہا کہ خدا کو نہ دنیا میں دیکھا جا سکتا ہے نہ آخرت میں تو علماء نے اس کے جوابات دیئے مگر عوام کے دل میں ان کا جواب زیادہ نہیں بیٹھتا تھا۔ معتزلہ کا شبہ زیادہ بیٹھتا تھا۔ اس سے بہت سوں کے ایمانوں میں خلل پڑنا شروع ہوا۔

جب علماء عاجز آ گئے تو اخیر میں عارفین اور محققین کی طرف رجوع ہوا کہ وہ اربابِ مشاہدہ ہیں وہ اپنے تصرفِ باطن اور کمالاتِ باطن سے کچھ کہتے ہیں تو وہ دل سے جا کے ٹکراتی ہے۔ لمبی تقریریں وہ اثر نہیں کرتی جو کہ ایک عارف باللہ کا چھوٹا سا کلام اثر کر جاتا ہے۔ اخیر میں صوفیاء کی طرف رجوع کیا گیا۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ کی طرف رجوع کیا اور کہا کہ حضرت یہ قصہ پیش آ رہا ہے، ہم تو عاجز آ چکے ہیں، دلائل دیتے دیتے تھک گئے مگر دعویٰ باریک ہے اللہ کے دیدار اور قیامت کے واقعات اس دنیا میں سمجھانا جبکہ یہاں کے بندے بندۂ اسباب ہیں، بہت مشکل ہے کس طرح سمجھائیں؟ ہم نے سب کچھ کر لیا مگر لوگوں کے ذہنوں میں نہیں بیٹھتا اب آپ کا کام ہے کہ مخلوق کو سنبھالیں۔

فرمایا کہ اچھا ہم مناظرہ کریں گے۔ اس کا اعلان کر دو۔ چنانچہ د[ن]
مقرر ہو کر جامع مسجد رصافہ میں بغداد کے لاکھوں آدمی جمع ہوئے۔ ا[ور]
تو اس بنا پر کہ حضرت جنیدؒ وعظ کہیں گے۔ جنہوں نے کبھی وعظ نہ[یں]
کہا۔ ایک نئی چیز سامنے آتی ہے تو مخلوق خود بخود امنڈ آتی ہے کہ کو[ئی]
عجیب بات ہوگی۔

اور پھر یہ کہ مناظرے کا اعلان تھا اور مناظرہ جھگڑے کی چیز ہے
اور جھگڑے سے عوام کو زیادہ مناسبت ہوتی ہے، تعمیری چیز دل[وں]
کی طرف اتنی توجہ نہیں کرتے جتنا جھگڑوں کی چیزوں کی طرف توجہ کر[تے]
ہیں۔ جھگڑالو زیادہ سرنام[1] ہو جاتا ہے اور بے چارہ تعمیر کنندہ[2] کچھ مغلوب
سا رہ جاتا ہے۔

بہرحال جامع مسجد رصافہ میں لاکھوں آدمی جمع ہوئے، حضرت جنید
رحمۃ اللہ علیہ آکر منبر پر بیٹھے، لاکھوں آدمیوں کا مجمع تھا۔ معتزلہ کے بڑے
علماء بھی سامنے آئے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے پوچھا کہ تمہارا کیا دعویٰ ہے
تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

معتزلی عالم نے کہا: میں یہ کہتا ہوں کہ خدا کو اس کی مخلوق نہیں دیکھ
سکتی۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اس کا دیدار محال ہے۔

---

۱ مشہور ۲ مراد اصلاح کرنے والا

شیخ نے اس کے جواب میں ایک بھی دلیل نہ پیش کی بلکہ یہ کہا کہ میں
ایک چیز پوچھنا چاہتا ہوں اور تمہارے ضمیر[1] سے اپیل کرتا ہوں وہ یہ کہ
کیا تمہارا خدا کے دیکھنے کو دل چاہتا ہے؟

اس نے کہا ہاں! جی تو چاہتا ہے۔

فرمایا یہ دلیل ہے کہ خدا دیکھا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ دیکھنے کو جی اسی
چیز کو چاہے گا جو دیکھی جا سکتی ہے اور جس کا دیکھنا محال ہو اس کے دیکھنے
کو کبھی جی نہیں چاہے گا۔ کبھی آپ یہ نہیں چاہیں گے کہ میں خوشبو کو دیکھ
لوں، یہ جی چاہے گا کہ اس کو سونگھ لوں۔ کبھی آپ کا جی نہیں چاہے گا
کہ میں آواز کو دیکھ لوں۔ بلکہ اسے سننے کو جی چاہے گا۔ تو جو چیز جس
حاسے[2] سے سمجھی جاتی ہے۔ اُسی حاسے سے احساس[3] کرنے کی تمنا ہوتی ہے
دوسرے حاسے سے نہیں ہوتی۔

تو تم جب یہ کہتے ہو کہ خدا کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے تو اس کا مطلب
ہے کہ تمہارے ضمیر میں جی چاہنے کا داعیہ[4] موجود ہے جس سے معلوم ہوا کہ
حق تعالیٰ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ورنہ تمنا ہی پیدا نہ ہوتی۔ یہ دلیل ہے دیدار
کے ممکن ہونے کی۔ اب واقع ہونے کا مسئلہ یہ ہے کہ مخبر صادق[5] نے خبر
دی ہے کہ واقعہ ہوگا۔ تو امکان تم نے ثابت کر دیا۔ وقوع صاحب
شریعت نے ثابت کر دیا، اب بتاؤ تمہارا کیا دعویٰ ہے؟

---

۱ دل ۲ معلوم اور محسوس کرنے کی قوت۔ یہ انسان کے جسم میں پانچ ہیں، دیکھنے
کی، چکھنے کی، سننے کی، سونگھنے کی، چھونے کی، ۳ معلوم اور محسوس ۴ خواہش
۵ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اب وہ بے چارہ حیران ہو کر چُپ رہ گیا اس لیے کہ وہاں تو دل ہی پکڑا گیا۔ تو اہل اللہ ضمیر اور وجدان[1] سے اپیل کرتے ہیں۔ انسان کی سب سے بڑی دلیل اس کا ضمیر اور وجدان ہے۔ اندرونی ذوق جس کا تقاضا[2] کرے وُہی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اگر آپ مقدمات عقلی طور پہ دوسروں کے سامنے کچھ ثابت کر دیں تو یہ دلائل من گھڑت ہوں گے۔ اصل دعویٰ ضمیر میں ہوتا ہے جس کے ماننے پہ دل مجبور ہوتا ہے۔

توسب سے بڑی دلیل انسان کا وجدان اور ضمیر ہے۔

بعض لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تقدیر کے مسئلے میں بڑا شبہ ہے، جب انسان مجبورِ محض[3] ہے تو یہ جنت و دوزخ کیسی ہے۔ تو میں نے کہا کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ میں کوئی اختیار نہیں ہے؟

مسئلہ کی بنیاد اس پہ ہے کہ اگر انسان کے لیے اختیار ثابت ہو جائے تب تو تکلیفِ شرعی بھی درست ہے اور سزا و جزا بھی درست ہے۔ لیکن اگر اینٹ پتھر کی طرح مجبور ہو اور کوئی بھی اختیار نہ ہو تب بے شک یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اینٹ پتھر کی طرح مجبور ہے تو اسے خطاب کیوں جا رہا ہے کہ یہ کام کر اور یہ کام نہ کر۔ اور کیوں کہا جا رہا ہے کہ یہ کام کرے گا تو جنت ملے گی اور نہیں کرے گا تو جہنم میں جائے گا۔ جب وہ

---

[1] محسوس کرنے کی باطنی قوت [2] خواہش [3] بالکل بے بس۔

مجبورِ محض ہی ٹھہرا تو بے چارہ کیا کرے۔ اس لیے اصل مسئلہ اس پہ ہے کہ انسان میں اختیار ہے یا نہیں۔ اگر اختیار ثابت ہو جائے تو تکلیفِ شرعی بھی درست ہے، سزا و جزا بھی درست اور آخرت بھی درست۔ میں نے کہا کہ اختیار پہ بات آئی ہے تو شرعی دلائل کو تو پہلے الگ رکھئے میں آپ کے ضمیر سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ میں اختیار ہے یا نہیں۔

میں نے پوچھا کہ جب آپ کوئی اچھا کام کرتے ہیں تو آپ کو کچھ خوشی ہوتی ہے؟ کہنے لگے کہ ہاں خوشی تو ہوتی ہے۔

میں نے کہا یہی اس کی دلیل ہے کہ آپ اپنے کو مختار جانتے ہیں اگر مجبورِ محض ہو کر کام کرتے تو خوشی نہ ہوتی۔ اس لیے کہ آپ یہ سمجھتے کہ میں خود تھوڑا ہی کر رہا ہوں مجھ سے جبراً کرایا جا رہا ہے اس لیے مجھے خوشی کا کیا حق ہے۔

جب آپ کوئی بدکاری کرتے ہیں تو آپ کو غم اور ندامت[1] ہوتی ہے یہ ندامت اس کی دلیل ہے کہ آپ خود کو مختار جانتے ہیں۔ اسی لیے آپ اس قدر نادم ہوتے ہیں کہ آپ سے جواب نہیں بن پڑتا ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں چور سے اگر مجسٹریٹ کہتا کہ کیوں چوری کی تو چور جواب دیتا کہ صاحب "کیوں" کا سوال ہی نہیں میں تو اینٹ پتھر کی طرح مجبورِ محض ہوں، خدا نے مجھ سے کرادی۔ آپ کیوں مؤاخذہ کر رہے ہیں؟ لیکن

---

[1] شرمندگی۔

س کے برخلاف وہ ندامت کا اظہار کرتا ہے اور جھوٹ ، بیچ کے
ذریعہ جوابدہی کی فکر کرتا ہے اپنے ضمیر میں اس بات کو مانتا ہے کہ یہ
عل میں نے کیا ہے اور اپنے اختیار سے کیا ہے ۔ اس لیے کچھ ملمع سازی
کر کے مجھے اس کو نبھانا چاہیئے تاکہ کچھ برئیت ثابت ہو ۔ اس لیے اگر
ایسا نہ ہوتا تو آدمی ہر صورت میں اپنی مجبوری کا اظہار کر دیا کرتا کہ میں نے
زنا کر لیا تو مجبور تھا اور نماز پڑھ لی تو مجبور ۔

غرض نیکی کر کے دل میں خوشی کا آنا ، بدی کر کے دل میں ندامت کا آنا
اس کی دلیل ہے کہ آپ کا ضمیر آپ کو مجبور کے بجائے مختار باور کرا رہا
ہے ۔ یہ آپ صرف دکھلانے کو کہہ رہے ہیں کہ انسان مجبورِ محض ہے ور
آپ کا ضمیر گواہی دے رہا ہے کہ آپ مجبور نہیں ، مختار ہیں ۔ اور جب
مختار ہیں تو آپ سے خطاب صحیح ہو گیا ۔

پھر میں نے ان سے کہا کہ یہ تو ایک کتا بھی سمجھتا ہے کہ آپ میں اختیار
ہے ۔ اس واسطے کہ جب آپ کتے کو ڈھیلا پھینک کر مارتے ہیں تو وہ
انتقام لینے کے لیے ڈھیلے پر نہیں جاتا بلکہ آپ کی طرف آتا ہے ۔ وہ جانتا
ہے کہ ڈھیلا مجبور ہے اور یہ مختار ہے ۔

تو تعجب ہے کہ آپ کے اختیار کو وہ بھی سمجھتا ہے لیکن آپ نہیں
سمجھتے بلکہ کہہ رہے ہیں کہ میں مجبورِ محض ہوں ۔ جب کہ آپ کا دل آپ کو
مختار کہہ رہا ہے ۔ یہ جداگانہ بات ہے کہ وہ اختیار کس درجہ کا ہے ۔ اس
کو ناپ کر بتانے کے لیے ہمارے پاس کوئی ترازو نہیں ہے کہ اتنا اختیار

تو بندے میں ہے اور اتنا نہیں ہے ۔ اتنا مجبور ہے ، اتنا مختار ہے ،
مگر عقلاً اور وجداناً[۱] انسان میں اختیار بھی ہے ، جبر[۲] بھی ہے ۔ نہ مجبورِ محض
ہے ، نہ مختارِ مطلق ۔ ایسا مختارِ مطلق جس میں جبر کا نشان نہ ہو ، وہ اللہ
کی ذاتِ بابرکات ہے اور ایسا مجبورِ مطلق جس میں اختیار کا نشان نہ ہو
معدومات[۳] ہیں ۔ یعنی جن کو ابھی وجود ہی نہیں ملا کیونکہ جس میں وجود آگیا تو
ظاہر ہے کہ اس میں وجودی حد تک کمالاتِ وجود بھی آئیں گے ، اختیار
بھی آئے گا ۔ مگر انسان مجبور ہو کر بھی ایک حد تک معدوم رہتا ہے اس لیے
کہ اس کی اصلیت عدم[۴] ہے ۔ عدم سے نکال کر خدا نے وجود کا پرتو[۵] ڈالا
ہے تو اصلی عدم زائل نہیں ہوتا بلکہ وہ باقی رہتا ہے ۔ اسی لیے خواہ انسان
کی ذات ہو یا اس کی صفات ہوں یا افعال ہوں سب کو وجود اور عدم
دونوں نے گھیر رکھا ہے ۔

مثلاً آپ کی ذات ہے اور آپ ڈیڑھ گز لانبے ہیں تو ڈیڑھ گز کے
اندر تو آپ کا وجود ہے اور ڈیڑھ گز کے باہر آپ کا عدم ہے تو چاروں
طرف عدم ، بیچ میں تھوڑا سا ذات کا وجود ہے ۔ یہ نہیں کہ آپ لامحدود
وجود رکھتے ہیں کہ جہاں تک چلے جاؤ آپ ہی کا وجود نظر آئے ۔ بلکہ لا
محدود وجود نہیں ، محدود وجود ہے ، چنانچہ ایک حد میں آپ موجود ہیں
اور اس حد سے باہر آپ معدوم ہیں ۔ غرض ہر طرف عدم سے گھرا ہوا

---

[۱] محسوس کرنے کی باطنی قوت [۲] مجبوری [۳] جو چیزیں ابھی پیدا ہی نہیں ہوئیں
[۴] نہ ہونا [۵] عکس

ایک مختصر سا وجود ہے۔

یہی آپ کی صفات کا حال ہے، مثلاً آپ کا علم ہے اب وہ زیادہ سے زیادہ ہزار سالوں کا علم ہوگا، دو ہزار کا ہوگا، دس ہزار کا ہوگا۔ اس کے بعد عدمِ علم[1]۔ تو آپ کے علم کو چاروں طرف سے عدمِ علم نے گھیر رکھا ہے یعنی جہالت نے ہر طرف سے احاطہ کیا ہوا ہے جس کے بیچ میں تھوڑا سا علم ہے۔

یہی حال آپ کی قدرت کا ہے مثلاً آپ اس پہ قادر ہیں کہ یہ لاؤڈ سپیکر اٹھالیں، اس پہ بھی قادر ہیں کہ یہ ریکارڈنگ مشین ہاتھ سے اٹھالیں۔ چنانچہ جب بھی آپ سے کہا جائے گا، آپ تیار ہو جائیں گے۔

لیکن اگر آپ سے یہ کہا جائے کہ اس مسجد کو ذرا ہاتھ سے اٹھالیجئے، آپ کہیں گے کہ یہ تو میرے بس میں نہیں، کیونکہ قدرت کی ایک حد ہے کہ وہاں تک آپ قادر ہیں اور اس کے بعد عاجز ہیں تو آپ کی قدرت کو چاروں طرف سے عدمِ قدرت[2] نے گھیر رکھا ہے۔

تو علم میں عدمِ علم بھی اور علم بھی، بیچ میں تھوڑا سا علم، چاروں طرف عدمِ علم، قدرت میں بھی چاروں طرف عدمِ قدرت، بیچ میں تھوڑی سی قدرت، یہی صورت اختیار کی ہے کہ جب وجود ہے تو وجودی کمال اختیار ہے اس لیے تھوڑا سا اختیار ہے باقی عدمِ اختیار یعنی اختیار کا نہ ہونا جسے جبر کہتے

۱؎ علم کا نہ ہونا ۲؎ طاقت کا نہ ہونا۔

ہیں۔

تو آپ کسی حد تک مختار بھی ہیں، عالم بھی ہیں، جاہل بھی ہیں، قادر بھی ہیں، عاجز بھی ہیں، اس لیے کہ آپ وجود[1] و عدم[2] دونوں کا مجموعہ ہیں، اگر وجود[3] محض ہوتے تو علم محض[4] ہوتا، جہل کا نشان نہ ہوتا۔ وجود محض ہوتا تو عدم کا نشان نہ ہوتا اور اگر عدم[5] محض ہوتے تو وہاں جہل ہی جہل ہوتا، عجز ہی عجز ہوتا۔ لیکن دونوں کا جمع ہونا اس کی دلیل ہے کہ آپ میں کچھ وجود ہے کچھ عدم ہے، وجود اوپر سے آیا ہوا ہے جبکہ عدم آپ کی ذات میں رکھا ہوا ہے۔ یعنی وہ ذاتی اور اصلی ہے تو وجود عارضی ہے جو اوپر سے آیا ہے۔

اس کو ذرا واضح طور پہ آپ اس مثال کے ذریعہ سے سمجھ سکتے ہیں کہ سورج طلوع کرتا ہے تو دھوپوں کے ہزار ہا ٹکڑے آپ کے سامنے آتے ہیں جس انداز کے دروازے روشندان وغیرہ ہوتے ہیں اسی انداز کی دھوپ کی شکل بن جاتی ہے اگر گول روشندان ہے تو گول دھوپ آئے گی۔ چوکور ہے تو چوکور دھوپ آئے گی، مثلث ہے تو مثلث دھوپ آئے گی۔ تو یہ جو دھوپوں کے ٹکڑے ہیں ان کو مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ سورج ان کا موجد[6] ہے۔ یہ اس کی مصنوعات[7] اور اس کی مخلوقات ہیں، کہ کروڑوں رنگوں اور صورتوں کی دھوپیں دنیا میں پڑی

۱؎ ہونا ۲؎ نہ ہونا ۳؎ سراسر وجود ہی وجود ۴؎ سراسر علم ہی علم ۵؎ بالکل وجود ہی نہ ہونا ۶؎ بنانے والا ۷؎ بنائی ہوئی چیزیں

ہوئی ہیں۔ یہ گویا سورج کی موجودات ہیں جس نے ان شکلوں کو بنایا ہے۔

تو تھوڑی دیر کے لیے شکل کے اوپر غور کیجیے کہ شکل کسے کہتے ہیں۔ یہ شکل جو آپ کے سامنے ہے کب بنی جب نور[1] اور ظلمت[2] دونوں جمع ہوئے۔ چاروں طرف اندھیرا ہے۔ بیچ میں روشنی ہے جو گول دھوپ کی شکل بن گئی۔ اگر محض دھوپ ہی دھوپ ہو تو اس کی کوئی شکل نہیں ہوگی، یا اگر محض اندھیرا ہی اندھیرا ہو تو اس کی بھی کوئی شکل نہیں ہوگی۔ لیکن جب اندھیرا اور چاندنا جمع ہوں گے یعنی نور و ظلمت مجتمع[3] ہوں گے تو کوئی نہ کوئی شکل بن جائے گی۔

اس لیے شکل نور و ظلمت کے مجموعے یا چاندنے اُجالے کے مجموعے کا نام ہوا فقط چاندنے میں بھی شکل نہیں، فقط اندھیرے میں بھی شکل نہیں جب دونوں کو یکجا کر جمع کیا جائے گا تو شکل بن جائے گی۔

غرض شکل دو چیزوں کے مجموعے کو کہا جائے گا اور وہ چاندنا اور اندھیرا ہیں۔ اب اس پہ غور کیجیے کہ اس شکل میں یہ نور کہاں سے آیا؟ یہ ظلمت کہاں سے آئی؟ اب غور کریں گے تو نور تو آفتاب کی وجہ سے شکل میں آیا لیکن ظلمت تو آفتاب کی وجہ سے نہیں آئی آفتاب میں ظلمت کا نشان ہی نہیں۔

---

[1] روشنی [2] اندھیرا [3] اکٹھے ہوں گے جمع ہوں گے۔

تو درحقیقت وہ ظُلمت اس شکل کی ذات میں رکھی ہوئی ہے جس کو اس نور نے چمکا دیا کہ اس کے اندر اتنا اندھیرا ہے اگر اس پہ نور نہ پڑتا تو اس کا اندھیرا بھی نہ کھلتا۔ اگر یہ ہم میں وجود نہ آتا تو ہمارا معدُوم ہونا بھی واضح نہ ہوتا، ہمارا عدم بھی جبھی کھلا جب ہمارے اندر وجود آگیا۔ تو اس شکل کی ظلمت جب کھلی جب اس کے اوپر آفتاب نے نور ڈال دیا۔ تو نور آفتاب سے آیا ہے اور ظلمت اس شکل کی ذات سے آئی ہوئی ہے یعنی اس کے اندر موجود ہے جس کو آفتاب کے نور نے ذرا سا دھکیل دیا ہے۔

تو عدم ہماری ذات میں ہے اور وجود اللہ کی طرف سے آیا۔ عدم اللہ کے ہاں سے نہیں آیا وہاں عدم کا نشان نہیں۔ اس نے وجود ڈالا تو وجود سے یہ بات کھل گئی کہ ہمارے اندر عدم بھی موجود ہے تو جیسا کہ وہ شکل نور اور ظلمت کا مجموعہ ہے کہ نور آفتاب کی طرف سے آیا، ظلمت شکل کی ذات کی طرف سے آئی۔ اسی طرح ہماری حالت ہے کہ اللہ نے ہم کو وجود دیا اور عدم ہماری ذات میں تھا تو نور وجود وہاں سے آیا جب کہ ظلمت عدم ہمارے اندر ہے۔ اس لیے جو بھی ہمارے افعال یا صفات ہوں گی دونوں میں وجُود اور عدم دونوں ملے ہوئے رہیں گے۔ تو علم میں عدم بھی ہے وجود بھی ہے، قدرت میں وجود بھی ہے، عدم بھی ہے، اختیار میں وجودِ اختیار بھی ہے، عدم اختیار بھی ہے۔ تو چونکہ انسان میں سے عدم کے خواص و آثار تو جا نہیں سکتے کیونکہ اصلیت عدم ہے اس واسطے اسے یوں نہیں کہہ سکتے کہ یہ موجود

محض ہے اور یوں بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ معدوم محض اور ناقصِ محض ہے
اس لیے کہ نقص اور کمال دونوں جمع ہیں کہ کچھ کمال ہے کچھ نقصان ہے۔
یہی مذہب ہے اہل سنت والجماعت کا کہ انسان نہ مختارِ مطلق
ہے نہ مجبورِ محض ہے، کچھ مختار ہے کچھ مجبور ہے۔ اب یہ بتانے کے
لیے کوئی پیمانہ ہمارے پاس نہیں ہے کہ کتنا اختیار ہے اور کتنا عدمِ اختیار
ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سمجھانے کے طور پر اسے بھی سمجھایا
اور عوام الناس کے سمجھانے کے لیے مثال بالکل کافی تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ کیا میں مختارِ
مطلق ہوں۔؟

فرمایا "نہیں"!

تو کیا میں مجبورِ محض ہوں؟

کہا "نہیں"!

مختار و مجبور دونوں ہوں؟

فرمایا "ہاں دونوں کا مجموعہ ہو، کچھ مختار، کچھ مجبور

اس نے پوچھا کہ کتنا مختار ہوں، کتنا مجبور ہوں؟

فرمایا "ٹانگ اٹھا کر کھڑا ہو جا" وہ ایک ٹانگ اٹھا کے کھڑا ہو
گیا۔

فرمایا "دوسری بھی اٹھا لے اور کھڑا رہو؟

کہا "یہ تو نہیں کر سکتا۔

فرمایا "بس اتنا مختار، اتنا مجبور!

تو اس طرح انہوں نے ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا اور یہ تبلادیا کہ کسی
حد تک اختیار چلتا ہے، کسی حد سے آگے جواب دیدیتا ہے۔

تو بہر حال عقلاً اتنا ثابت ہے اور وجداناً اور ضمیر کے طور پہ یہ مُسلّم
ہے کہ انسان مختار ضرور ہے اور جب عقلاً اور وجداناً مختار ہونا ثابت
ہو گیا تو تکلیف شرعی بھی درست ہو گئی، سزا اور جزا بھی درست ہو گئی
آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اینٹ پتھر کی طرح مجبورِ محض ہوں، مجھے کیوں خطاب
کیا جاتا ہے، مجھے کیوں سزا و جزا دی جاتی ہے، میں تو اینٹ کی مانند ہوں!
یہ غلط ہے! اس کا ضمیر یہ نہیں سمجھتا کہ وہ اینٹ کی مانند ہے۔

تو بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ سب سے بڑی دلیل انسان کا ضمیر اور
اس کا وجدان ہے، ضمیر مخلّی بالطبع[1] ہو کر جس چیز کو مانتا ہے اس کے مقابلے
میں ہزاروں دلیلیں ایک طرف ہیں اور وہ ضمیر ایک طرف ہے۔ تو اہل
اللہ وجدان[2] کو اپیل کرتے ہیں، ضمیر سے سوال کرتے ہیں۔ ضمیر سے جب
آدمی انصاف کرتا ہے تو بات حق نکلتی ہے۔

تو حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ خدا کے دیکھنے کی تمنا بھی ہے؟
کہا ہاں تمنا ہے اور جی بھی چاہتا ہے۔ کہا یہ دلیل ہے دیدار کے ممکن ہونے

---

[1] خالی ذہن [2] معلوم کرنے کی باطنی طاقت

کی۔ اگر محال ہوتا تو محال کی تمنا آدمی کو کبھی ہو ہی نہیں سکتی، تو امکان
تو نے ثابت کر دیا، وقوع مخبر صادقؐ کی خبر نے ثابت کر دیا۔ اس لیے
ممکن بھی ہے اور واقع بھی ہوگا۔

اصل دلیل یہ ہے اور اسی طرح میں عرض کر رہا تھا کہ معجزات کے
سلسلے میں چونکہ انسان ضمیر کو خراب کر لیتا ہے اور اسباب میں پھنس جاتا ہے
اس واسطے شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ان سے ہٹ کر خالص
اپنے ضمیر پر غور کرے تو حق حق نظر آئے گا اور باطل باطل نظر آئے گا۔
بعض دفعہ تعصبات بعض دفعہ تقلید، بعض دفعہ کچھ سوسائٹی کی روایات
جیسی چیزیں آدمی کے ذہن کو خراب کر دیتی ہیں۔ ان سب سے الگ ہو
کر اور مخلی بالطبع ہو کر جب غور کرے گا تو چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں
ایک نور رکھا ہے اس لیے حق و باطل سمجھ میں آجائے گا۔ تفصیل سے آئے
یا اجمال[1] سے آئے مگر واضح ہو جائے گا۔

تو سب سے بڑی دلیل انسان کا ضمیر اور انسان کا وجدان نکلا۔ اس
لیے انبیاء وجدان ہی کو اپیل کرتے ہیں، ضمیر کو درست کر دیتے ہیں کہ
اس میں خس و خاشاک[2] نہ پڑنے پائیں۔

تو انبیاء نے معجزہ دکھلا دیا اب ضمیر صاف ہو تو وہ کہہ سکتا ہے کہ جب
خدا نے انسان تک کو پیدا کر دیا جو ایسی کامل مخلوق ہے کہ اس کی وجہ سے
دنیا میں چاند بنا ہے تو اور چیزیں تو سب نیچی نیچی ہیں جنہیں خدا پیدا کر دے تو

[1] اختصار [2] مراد ردی خیالات

تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کے دو ٹکڑے
کر دیئے تو کوئی ناممکن اور قیاس سے باہر بات نہیں ہے اس لیے کہ معجزہ
ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے لیے سب آسان ہے۔ جب حضورؐ جیسی
ذاتِ مقدس کو اللہ تعالیٰ پیدا کرنے پر قادر ہے کہ جو سارے عالموں پر بھاری
اور سارے عالموں سے افضل ہے تو چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا اس کی
قدرت کے سامنے کوئی چیز نہیں۔ مگر یہ جب ہو کہ جب وجدان صاف ہو
اسباب کی عادتوں نے وجدان کو خراب نہ کیا ہو مگر عام طور سے وجدان اور
ضمیر خراب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے حق تعالیٰ نے معجزات کے لیے کچھ حسی مثالیں
پیدا فرمائیں تاکہ ان کو دیکھ دیکھ کر آدمی کو انکار کرنے کی قدرت باقی نہ رہے
تو کل تک معراج کا انکار تھا مگر جب فلسفیوں نے ارادہ کیا کہ ہم چاند تک جائیں
گے۔ تو ان کے ذہن میں جا سکنے کا امکان آجانا معراج کے ممکن ہونے کی دلیل
ہے۔ ان کے ضمیر نے ثابت کر دیا کہ آسمانوں تک آدمی پہنچ سکتا ہے۔
اس لیے اگر اللہ کا رسول پہنچ جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ فرق اتنا
ہوگا کہ تم مادی اسباب سے پہنچو گے، وہ روحانی اسباب سے پہنچیں گے۔
اس کو سب جانتے ہیں کہ مادیات میں وہ قوت نہیں ہے جو روحانیات
کے اندر ہے۔ اس واسطے کہ مادی چیزیں کثیف[1] ہوتی ہیں اور روحانی چیزیں
لطیف[2] ہوتی ہیں اور لطیف چیز بہ نسبت کثیف کے زیادہ طاقتور ہوتی
ہے۔ دنیا میں بھی کثیف چیزیں متحرک[3] ہوتی ہیں۔ لطیف چیزیں محرک[4]

[1] موٹی، غلیظ، سخت [2] نازک، صاف، عمدہ، نرم [3] حرکت کرنے والی [4] حرکت دینے والی۔

بنتی ہیں۔ وہ اپنی طاقت سے انہیں ہلاتی ہیں۔

آپ کسی فیکٹری میں جائیں تو ہزار ہا من لوہے کی بڑی بڑی چکریں،
بڑے بڑے پلّے اور پہیے گھوم رہے ہیں اور ایک فیکٹری ہے۔ ہزاروں
پہیہ گھوم رہا ہے۔ مشینیں چل رہی ہیں لاکھوں من لوہا ناچ رہا ہے، اسے
کون نچا رہا ہے؟ آپ غور کرکے دیکھیں گے تو پاور ہاؤس میں جو سٹیم ہے
وہ انہیں حرکت دے رہی ہے، سٹیم کا نہ کوئی بدن ہے نہ ظاہری طور کا اس
کا کوئی وجود نظر آتا ہے۔ آنکھوں سے اوجھل ہے مگر وہ سٹیم ہی حرکت دے
رہی ہے، اس کی حرکت سے لاکھوں من لوہا ناچ رہا ہے۔ تو سٹیم ذرا
سی جگہ میں ہے، بے حد لطیف چیز ہے اور یہ کثائف[1] اس کے اوپر
گھوم رہی ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ کثیف طاقت ور نہیں ہوتا بلکہ اس
کے مقابلے میں لطیف طاقتور ہوتا ہے۔ جتنی لطافت بڑھتی جائے گی۔
اتنی ہی طاقت بڑھتی جائے گی۔

حدیث میں فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب اللہ نے زمین
پیدا کیا اور وہ پانی پہ تیرائی گئی تو زمین ہلنے اور لرزنے لگی کیونکہ پانی کے
اوپر تھی فخلق الجبال فقال بہا علیہا اللہ نے اس کے رکنے کے
لیے اس کے اوپر پہاڑ بنائے و الجبال اوتادا پہاڑوں کو گویا میخ
بنا کر زمین کے اندر ٹھوک دیا۔ چنانچہ ان کے بوجھ سے حرکت بند ہوگئی
تو پہاڑوں کی شدت و مضبوطی اور سختی کو دیکھ کر ملائکہ نے عرض کیا کہ یارب

---

[1] کثیف کی جمع ہے، بہت کثیف چیزیں۔

ھل من خلقک شیئ اشد من الجبال۔ ؟ یا اللہ میاں آپ کی
مخلوق میں پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز ہے؟ یعنی یہ تو بڑی زبردست
معلوم ہوتی ہے کہ زمین جیسے عظیم کُرّے کی جو ہل رہی تھی حرکت روک دی
اسے اپنی قوت سے دبا دیا تو یہ پہاڑ تو بڑی طاقت ور چیز معلوم ہوتی ہے
کہ جسم بھی بڑا اور صلابت و سختی بھی زیادہ تو ھل من خلقک شیئ اشد
من الجبال؟ آپ کی مخلوق میں کیا پہاڑ سے بھی زیادہ کوئی سخت چیز ہے
قال نعم الحدید۔ فرمایا ہاں لوہا اس سے زیادہ سخت ہے لوہے کی
ایک کدال لے کر آدمی ہزاروں من کی چٹان کے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ یہ
جو ریل کی پٹڑیوں کے کنارے لاکھوں من پتھر کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں
یہ پہاڑوں کے جگر کے ٹکڑے ہیں جنہیں انسانوں نے کدالیں لے کر اور
توڑ توڑ کر یہاں لگا دیا۔

تو لوہے میں وہ طاقت ہے کہ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دے، جب
لوہے کی کدال سامنے آتی ہے تو ان کی ساری سختی دھری رہ جاتی ہے۔
تو فرمایا میری مخلوق میں پتھر سے زیادہ شدید چیز لوہا ہے تو ملائکہ نے عرض کیا
کہ یارب ھل من خلقک شیئ اشد؟ یا اللہ میاں! کیا لوہے سے
بھی زیادہ کوئی سخت چیز ہے؟ حق تعالیٰ نے فرمایا ہاں! قال نعم النار
آگ اس سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اس لیے کہ جہاں آگ
کے اندر لوہے کو ڈالا کہ وہ پگھل کر پانی ہوا۔ پرنالے میں سے اس طرح بہتا
ہے جیسے پانی بہہ رہا ہو دور سے نظر آتا ہے آگ نکل رہی ہے

اور حقیقت میں وہ لوہا ہوتا ہے جو آگ کی شکل میں پانی ہو کر بہتا ہے۔
آپ نے فولاد کے کارخانوں میں دیکھا ہوگا پرنالوں سے لوہا پانی کی
طرح بہتا ہے جو آگ کا اثر ہے۔ تو آگ میں وہ طاقت ہے کہ لوہے جیسی
سخت چیز کو نرما کر اور پگھلا کر پانی کر دیتی ہے۔ لوہا اپنی ساری سختی بھول
جاتا ہے کیونکہ آگ اس سے زیادہ طاقت ور ہے

تو ملائکہ نے پھر سوال کیا کہ یا رب ھل من خلقک شیء اشد
من النار؟ اللہ میاں آپ کی مخلوق میں آگ سے بھی زیادہ کوئی سخت چیز
ہے قال نعم الماء، فرمایا ہاں پانی اس سے زیادہ سخت ہے۔ اس
واسطے کہ اگر بیسیوں بیگھے زمین میں آگ جل رہی ہو اور پانی کے چھینٹے دیئے
جائیں تو آگ بچاری اسی وقت ختم ہو جائے گی سارا کر و فر[1] جاتا رہے گا
پانی اس کے اوپر غالب آجاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے پانی میں اس سے زیادہ
طاقت ہے۔

تو پھر ملائکہ نے سوال کیا کہ یا اللہ میاں آپ کی مخلوق میں پانی سے بھی
زیادہ کوئی سخت چیز ہے؟ قال نعم الھواء فرمایا ہاں "ہوا"، اس سے
بھی زیادہ سخت ہے۔ جب ہوا کے جھکڑ چلتے ہیں تو سمندر تہ و بالا ہو کر
چاروں طرف مارا مارا پھرتا ہے، ہوا اسے چین نہیں لینے دیتی، وہ تھمنا
چاہتا ہے مگر ہوا کا ایک جھونکا چلتا ہے اور اس میں موجیں اٹھتی ہیں،
ادھر کا ادھر ہو جاتا ہے۔ گویا ایک دوسرے کے اوپر موجیں گر رہی ہیں

[1] شان و شوکت

اور سمندر اس طرح پچھاڑیں کھا رہا ہے جیسے اپنے آپے میں نہیں ہے
اس لیے کہ ہوا اس کے اوپر مسلط ہے، تو ہوا پانی سے بھی زیادہ سخت ہے
تو یہ عناصر اربعہ آگ، پانی، مٹی، ہوا، سائنس کا موضوع ہیں جسے اس
حدیث نے واضح کیا۔ کہ سب سے زیادہ سخت پتھر، اس سے زیادہ سخت
لوہا، اس سے زیادہ سخت آگ، اس سے زیادہ سخت پانی اور اس سے
زیادہ سخت ہوا ہے۔ اگر آپ اس کا معیار دیکھیں کہ یہ چیزیں کیوں سخت
ہیں اور دوسرے ان کے مقابلے میں کیوں نرم ہیں تو معیار لطافت اور کثافت
نکلے گا۔ جس میں لطافت بڑھتی گئی، اس میں طاقت بڑھتی گئی، جس میں لطافت
کی کمی آتی گئی ہے اس میں ضعف[1] بڑھتا گیا ہے، پتھر میں قوت ہے لیکن پتھر
سے زیادہ ستھرائی اور لطافت لوہے کے اندر ہے۔ اگر پتھر کو توڑیں تو اس
کا برادہ گرے گا جو کپڑے کو آلودہ کرے گا لیکن اگر لوہے کا برادہ گرے گا
تو کپڑے کے اوپر کوئی گرد نہیں پڑے گا۔ جھاڑو تو کپڑا صاف کا صاف۔
کیونکہ ستھرائی زیادہ ہے اس لیے اس کے جسم میں لطافت بھی بڑھ گئی اور
طاقت بھی بڑھ گئی۔

آگ کو دیکھا جائے تو وہ لوہے سے زیادہ لطیف ہے اس لیے کہ
لوہے میں چمک بالکل نہیں جب کہ آگ میں چمک ہے اور اس کی لطافت
کا یہ عالم ہے کہ لوہے پر انگلی مارو تو انگلی ٹوٹ جائے گی اور آگ کے اندر
سارا ہاتھ دیدو، ادھر کا ادھر نکل جائے گا اور آگ بدستور باقی رہے

[1] کمزوری

گی۔ یہ اس کے جسم کی لطافت کی بات ہے کہ اس سے کوئی چیز ٹکراتی نہیں
اور اگر لگتی بھی ہے تو وہ اس چیز کو روکتی نہیں بلکہ وہ چیز ادھر سے ادھر
نکل جاتی ہے لیکن آپ لوہے میں تو نکال دیں۔ ؟ معلوم ہوا کہ اس کے جسم
میں باریکی، رقت اور لطافت زیادہ ہے اس لیے اس کی طاقت بھی بڑھ
گئی۔ تو آگ کے اندر لوہے سے زیادہ لطافت ہے۔ لہٰذا طاقت بھی
زیادہ ہے۔

آگ سے زیادہ طاقت ور پانی ہے کیونکہ پانی میں آگ سے بھی
زیادہ لطافت ہے۔ اس لیے کہ آگ کتنی ہی لطیف ہو ادھر سے اُدھر
کی چیز نظر نہیں آسکتی۔ لیکن پانی میں دیکھا جائے تو ادھر کی چیز اُدھر سے
نظر آجائے گی۔ صاف ستھرا پانی اگر گز دو گز تک بھی ہے تو تہ کی چیزیں جو
اس میں پڑی ہوئی ہیں نظر آجاتی ہے کیونکہ پانی نگاہوں کو نہیں روکتا، آگ
نگاہ کو روکتی ہے، چاہے آگ کی پتلی سی چادر ہو لیکن نگاہ آر پار نہیں جا
سکتی۔ اس کے جسم میں اتنی کثافت ہے اور پانی کے جسم میں اتنی لطافت ہے کہ
نگاہیں پار ہو جاتی ہیں، ہاتھ ڈالا جائے تو وہ ہاتھ کو نہیں روکتا پھر برابر ہو جا
ئے گا۔ نگاہ ڈالو تو نگاہ کو نہیں روکتا، تو اس میں لطافت زیادہ ہے یہاں
تک کہ جب پانی ستھرا ہوتا ہے تو اس میں آدمی کی صورت نظر پڑتی ہے
اس میں اتنی چمک پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ آئینے کا کام دیتا ہے تو جو چیز صورت
بھی دکھلا دے مگر بھی نہ دے اور نگاہوں کو بھی نہ روکے اس سے زیادہ
لطافت کس میں ہوگی ! آگ میں یقیناً یہ لطافت نہیں ہے ! تو لطافت

بڑھنے سے طاقت بھی بڑھ گئی۔

اس سے آگے ہوا ہے، ہوا کی لطافت کا یہ عالم ہے کہ انسان بیٹھا
ہوا ہے اور ہوا چاروں طرف گھوم رہی ہے لیکن نگاہ جیسی لطیف چیز
اس پر کارگر نہیں ہوتی اور وہ ہوا کو اپنے اندر نہیں سما سکتی۔ تو نگاہ لطیف
تھی مگر نگاہ سے بھی زیادہ لطیف ہوا کا جسم ہے کہ نگاہ ہوا کا احاطہ نہیں
کر سکتی جس کا سبب ہوا کی لطافت ہے تو اس لطافت کی وجہ سے وہ کسی
چیز کو نہیں روکتی، نہ وہ نگاہ کو روکتی ہے نہ کسی دوسری چیز کو۔ حالانکہ فضا
میں لاکھوں ڈگری ہوا بھری پڑی ہے لیکن یہاں کی چیزیں میلوں سے نظر
آتی ہیں کیونکہ ہوا نگاہوں کو نہیں روکتی۔ اس کے مقابلے میں پانی میں یہ لطافت
نہیں ! تو لطافت بڑھی تو طاقت بھی بڑھ گئی۔

ملائکہ نے عرض کیا یا اللہ میاں ! آپ کی مخلوق میں ہوا سے بھی زیادہ
کوئی طاقت ور چیز ہے ؟

قال نعم بنی آدم اذا تصدق صدقۃ فاخفاھا حتی لا تعلم
شمالہ ما تنفق یمینہ

فرمایا ہاں ! بنی آدم ہوا سے بھی زیادہ قوی ہے جبکہ صدقہ دے اور
اس طرح دے کہ دائیں ہاتھ سے جو دے رہا ہے اس کے دینے کا بائیں ہاتھ
کو پتہ نہ چلے۔ یعنی انتہائی کمالِ اخلاص اور ایثار سے دے۔ یہ ترکِ دنیا کی
طرف اشارہ ہے کہ جو انسان دنیوی لذات کو ترک کر کے ان سے غنی بن جائے
اس کی روح میں وہ طاقت ہوگی جو نہ ہوا میں طاقت ہے نہ آگ میں طاقت

ہے۔ اسی واسطے انسان تمام کائنات پر غالب ہے، نہ ہوا کا غلبہ، نہ پانی کا غلبہ، بلکہ پانی پر بھی، ہوا پر بھی، مٹی پر بھی، آگ پر بھی انسان کا غلبہ ہے۔ اور اتنا غلبہ ہے کہ ان چیزوں کی طبیعت کے خلاف ان پر انسان حکمرانی کرتا ہے اور انہیں مجبور کر لیتا ہے۔ پانی کی طبیعت یہ ہے کہ نیچے کو جائے مگر انسان پائپ اور مشینوں کے ذریعہ اسے حکم دیتا ہے کہ اوپر کو چل، تو آٹھویں دسویں، یہاں تک کہ سودیں منزل پر بھی پانی جا رہا ہے اگرچہ جی نہیں چاہتا مگر جانے پر مجبور ہے۔ انسان نے مشین لگا کے اسے ابھار دیا ہے اور اب وہ جانے پر مجبور ہے۔

آگ کی خاصیت یہ ہے کہ اس کی لَو اوپر کو اٹھے گی لیکن مشینوں اور برقی چولہوں کے ذریعے آپ اس کی لَو کو کبھی اوپر کو نکال دیتے ہیں، کبھی نیچے کو نکال دیتے ہیں، کبھی دائیں کو اور کبھی بائیں کو۔ تو آپ کے سامنے آگ مجبور ہے۔ وہ ادھر ہی چلے گی جدھر اسے آپ چلائیں گے۔

ہوا جیسی چیز جو ساری فضا میں بھری پڑی ہے اور اس کی طاقت بھی معلوم ہے مگر عاجز آئی تو انسان کے سامنے کہ اس بے چاری کو جیل خانہ میں بند کریں تو اسے بند ہونا پڑتا ہے۔ مثلاً آپ اسے ٹائروں میں بند کر دیتے ہیں۔ ٹیوب میں بند کر دیتے ہیں، فٹ بالوں اور گیندوں میں بند کر دیتے ہیں۔ جب آپ گیند کو زمین پر ٹپے کے مارتے ہیں تو وہ گدا کھا کے دو گز پانچ گز اوپر جاتی ہے۔ یہ ہوا ہی ہے جو اس کے اندر بلبلا رہی ہے مگر انسان نے اسے جیل خانے کے اندر بند کر رکھا ہے۔ اگر ہوا نکال لی

جائے تو گیند میں کوئی طاقت نہیں اسے زمین میں ڈال دیا جائے تو وہ بالکل نہیں اچھلے گی، وہ ہوا ہی ہوتی ہے جو چوٹ پڑے پر اوپر جانا چاہتی ہے۔ آپ جب اسے زمین پر ٹپے مارتے ہیں تو وہ اوپر جانے کے لیے زور لگاتی ہے جہاں تک زور ہوتا ہے چلتی ہے پھر بے چاری نیچے آپڑتی ہے انسان کے ہاتھوں اتنی قید ہے کہ چوں نہیں کر سکتی۔ تو کہیں ٹائروں میں بند ہے، کہیں ٹیوب میں بند ہے۔

اور اگر نکالنا چاہیں تو مشینوں کے ذریعے ڈبوں میں سے ہوا نکال کر ان میں پھل رکھ دیتے ہیں اور ڈبے بند کر دیتے ہیں اب وہ پھل سڑتے نہیں حالانکہ برس برس دن رکھے رہتے ہیں اس لیے کہ ہوا نکال لی گئی ہے۔ تو جہاں سے نکالنا چاہا اسے کان پکڑ کے نکال باہر کیا اور جہاں بند کرنا چاہا اسے کان پکڑ کے لائے اور بند کر دیا وہ بے چاری چوں بھی نہیں کر سکتی۔ اب سوچیے کہ وہ طاقتور ہے یا انسان طاقتور ہے؟

اور آگے بڑھیے تو بجلی اس سے بھی زیادہ طاقتور ہے کہ پہاڑوں پر گرے تو انہیں دو پارہ کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے مگر قیدی ہوئی تو انسان کے ہاتھ میں آکے ہوئی۔ یہ مصنوعی بجلی ہے ویسے بجلی بنائی ہوئی چیز نہیں ہے بنی بنائی ہے جسے خدا نے پانی اور آگ میں رکھا ہے۔

تو غرض اسے زبردستی اس کے گھر میں سے کھینچ کر پاور ہاؤس نے نکال لیا وہ مٹی میں چھپی پڑی تھی مگر پاور ہاؤس نے لا کے مشینوں میں بند کر دیا مشینوں کے ذریعے آپ نے اسے باریک باریک تاروں میں پھیلا دیا۔

اب بے چاری کی گرفتاری کی یہ کیفیت ہے کہ سوئچ کو نیچے کر دیا جائے
تو ہاتھ جوڑ کے آموجود ہوتی ہے اور اوپر کو کر دیا جائے تو جانے پہ
مجبور ہو جاتی ہے۔ جو پہاڑوں کے ٹکڑے کر ڈالتی تھی وہ انسان کے
ہاتھوں میں عاجز اور مجبور ہے اور باریک باریک تاروں میں گرفتار ہے
جیسے مثل مشہور ہے کہ کچے دھاگے میں چلے آئیں گے سرکار بندھے۔ تو
اس اڑتے ہوئے پرندے کو انسان نے کچے دھاگے میں باندھ رکھا ہے
اب وہ بے چاری اتنی عاجز ہے کہ کچھ نہیں کر سکتی۔ تو آگ پر بھی تسلط اور
پانی پر بھی تسلط۔ اور پھر ایک تسلط تو استعمال کا ہے۔ استعمال تو سب
کرتے ہیں استعمال ہی نہیں کرنا بلکہ مجبور کر کے اپنے احکام پہ
چلانا کہ تیری طبیعت چاہے نہ چاہے تجھے چلنا پڑے گا۔ پانی کو مجبور
کیا کہ تو نیچے جانا چاہتا ہے ہم تجھے اوپر لے جائیں گے۔ آگ کو مجبور کیا
کہ تو اوپر جانا چاہتی ہے ہم تجھے نیچے لائیں گے۔ ہوا پھیلنا چاہتی ہے
مگر انسان نے اس غریب کو بند کر کے عاجز کر دیا۔

تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان سب سے بڑا طاقت ور ہے۔ یہ طاقت
تو مادی طاقت ہے جو اسباب کے ذریعے سے ہے۔

اب اندازہ کیجئے کہ جب طاقت لطافت میں ہوتی ہے تو جن میں
خالص روحانی لطافت ہو گی ان کی قوتوں کا کیا حال ہو گا۔ جب تھوڑی
سی لطافت سے مادیات پر قبضہ ہے اور مادیات میں موثرہ لطافت ہے تو
جن میں خالص لطافت ہے یعنی جو مجردات ہیں جیسے ملائکہ یا انبیاء۔ ان کی

قوتوں کی کیا حد و نہایت ہو گی اور ان کی قوتیں کہاں تک پہنچیں گی۔ اس لیے
کہ یہ اصول آپ نے مان لیا کہ طاقت ور لطیف چیز ہوتی ہے اور کثیف چیز
ضعیف ہوتی ہے جیسے بھاپ کی طاقت پر مشینیں چل رہی ہیں اور لاکھوں من
لوہا ناچ رہا ہے۔

اب سوال یہ ہو گا کہ بھاپ کہاں سے آئی؟ تو بھاپ لانے والا انسان
ہے۔ معلوم ہوا کہ اصل میں ان لوہوں کو انسان نچا رہا ہے جس نے اسٹیم کو واسطہ
بنا رکھا ہے اور اسٹیم خود انسان کے قبضہ میں ہے۔ تو پاور ہاؤس نے اسٹیم
چلائی اور پاور ہاؤس کو جو چکر دے رکھا ہے وہ خود آدمی نے چکر دے رکھا
ہے۔

تو معلوم ہوا کہ آدمی بجلی سے بھی زیادہ لطیف ہے کہ یہ اس پہ غالب ہے
تو آدمی نے سٹیم کو ہلایا۔ پھر اب سٹیم کو انسان نے ہلایا تو انسان کو کس چیز نے ہلایا؟
ارادی قوت نے! انسان کے دل کے اندر جو ارادی قوت ہے وہ اتنی لطیف
چیز ہے کہ آج تک آپ نے نہ کسی کا ارادہ دیکھا اور نہ کانوں سے سنا۔ اس
ارادے نے کو حرکت دی تو مشین میں حرکت آئی اور مشین نے حرکت کی تو لاکھوں
من لوہے نے حرکت کی۔

تو اصل محرک آپ کا ارادہ ہوا۔ کیونکہ وہ اسٹیم سے بھی زیادہ لطیف ہے
بھاپ سے بھی زیادہ لطیف ہے۔ بھاپ کم از کم آنکھوں سے تو نظر آجاتی
ہے مگر آپ کا ارادہ دنیا میں کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ صرف آپ جانتے ہیں
کہ میرے اندر ارادہ ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ارادہ سب سے زیادہ لطیف چیز

ہے۔ ارادے اور عزم نے جب دماغ میں آکر گھر کیا اور اس میں چکر کھایا تو اس سے معقولیت پیدا ہوئی۔ گویا جب عقل کے اندر لپٹ کر ارادہ آیا تو مشینیں بن گئیں، انجن بن گئے، کارخانے بن گئے۔ تمدن بن گیا۔ تو وہ عقل میں معلوم ہوتا ہے اور اس سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ عقل ارادے کو حرکت دیتی ہے، ارادہ مشینوں کو حرکت دیتا ہے، مشینیں سامانوں کو حرکت دیتی ہے، ارادہ مشینوں کو حرکت دیتی ہیں جس سے سامان بن بن کر تیار ہو رہے ہیں۔

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سامانوں کی جتنی جگمگاہٹ ہے یہ انسان کی عقل جگمگا رہی ہے، ان میں عقل متمثل ہو رہی ہے عقل ہی نمایاں اور ان کے اندر گھسی ہوئی ہے۔ تو عقل نے ارادے کو حرکت دی اور ارادے نے مشینوں کو حرکت دی۔

اب یہ سلسلہ آگے چلے گا کہ عقل میں روشنی کہاں سے آئی؟ جس کا جواب یہ ہے کہ عقل میں روشنی آتی ہے علم کے ذریعے سے۔ تو معلوم ہوا کہ علم عقل سے زیادہ لطیف چیز ہے۔ اسی واسطے محض عقل کارآمد نہیں۔ جب تک علم اس کی مدد نہ کرے۔ جو لوگ تعلیم یافتہ نہیں ہیں وہ عقل مند کتنے ہی ہوں لیکن ان کی عقل کند رہتی ہے۔ اصل میں وہ علم ہے جو عقل کو چمکاتا ہے۔ اسی وجہ سے آپ کہتے ہیں کہ دیہات میں بے وقوف بستے ہیں اور شہروں میں عقل مند بستے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے دیہات میں بھی تو آپ کے ہی بھائی بند ہیں انہیں بے وقوف کیسے کہا جا سکتا ہے ان میں بھی وہی عقل ہے

جو آپ میں ہے۔ فرق اتنا ہے کہ آپ تعلیم یافتہ ہیں اور وہ بے چارے جہالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ تو جہالت نے عقلوں کو ماند اور کند کر رکھا ہے تعلیم پاکر عقلیں چمک گئیں اور اجاگر ہو گئیں۔

تو معلوم ہوا کہ عقل میں علم سے روشنی آتی ہے، علم نہ ہو تو عقل ماند پڑی رہتی ہے۔ اب علم کہاں سے آیا؟ تو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ لا تعلمون شیئاً۔ آپ کی ذات میں ذرہ برابر علم نہیں ہے بلکہ علم اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعہ آیا۔ تو لطیف چیز، لطیف[1] وخبیر کی طرف سے آئی ہے۔ یعنی معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے اپنے علم کو حرکت دی، علم وحی[2] بھیجا تو اس نے عقلوں کو چمکایا، عقلیں چمکیں تو انہوں نے ارادوں کو حرکت دی، ارادوں میں حرکت آئی تو اس سے مشینوں کو اور اسباب کو حرکت ہوئی، اسباب کو حرکت ہوئی تو سامان بنے، تمدین[3]، تمدن[4] بنا۔ اسی طرح سے اگر اس عقل نے ارادے کو حرکت دیں اور معنویات اور غیبی امور میں ارادہ اور عقل کام کرے تو وہ اجتہادی قوت ہو گی جس سے علوم اور معارف پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے۔

---

[1] قرآن میں اللہ کے ناموں میں سے لطیف بھی اللہ کا نام ہے [2] یہ بات تحقیق شدہ ہے کہ کسی انسان سے جب اللہ تعالیٰ کوئی کام کروانا چاہتا ہے تو اس کام کی صورت کا خیال اس کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح حیوانات جمادات، نباتات وغیرہ سب اپنی اپنی قابلیت کے مطابق علم وحی حاصل کرتے رہتے ہیں (حجۃ اللہ البالغہ) [3] دیہاتی [4] شہری زندگی۔

تو علوم اور معارف اجتہاد[1] سے پیدا ہوتے ہیں اور تمدنی سامان ایجاد[2] سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایجاد اور اجتہاد دونوں کو حرکت دینے والی چیز عقل ہے جب کہ عقل کو علم کی روشنی سے منور کر دیا جائے۔ اور وہ علم وحی ہے۔

تو مادی علوم سے عقل طبعی[3] بن جاتی ہے اور روحانی علوم سے عقل معاد[4] اور عقل شرعی[5] بن جاتی ہے۔ ایک عقل ایجادات کرتی ہے جس سے تمدن بنتا ہے۔ ایک عقل اجتہادات کرتی ہے جس سے دین بنتا ہے، ایک عقل اجتہادات کرتی ہے جس سے دین بنتا ہے اور گلدستے کی طرح سامنے آجاتا ہے مگر محرک[6] سب کے لیے وحی خداوندی ہے۔

تو اصل ہیں لطیف و خبیر اللہ ہے اس کی طاقتوں کی حد نہیں جس کے اندر ہر شے کا علم آتا ہے۔ تو علم طاقتور ہے جس سے وہ بھی طاقتور بن جاتا ہے علم روح پر آتا ہے تو روحانیت اجاگر ہو جاتی ہے۔ روحانیت میں جو طاقت ہے وہ مادیت میں نہیں۔ تو یہ مشینیں پاور ہاؤس سے چل رہی ہیں ہم اصل میں پاور ہاؤس سے نیچے کی طرف آتے ہیں کہ پاور ہاؤس میں بجلی

[1] دین کی باتوں میں کوشش کرنا [2] کوئی نئی چیز بنانا [3] دنیا کی چیزوں میں غور و خوض کرنے والی عقل [4] آخرت اور قیامت کا خیال رکھنے والی عقل۔
[5] شریعت کی باتوں کا خیال رکھنے والی عقل [6] حرکت دینے والی

نے مشین کو حرکت دی اب اگر کپڑے کی فیکٹری ہے تو کپڑوں کے تھان بن گئے وہ بازار میں بکے تو ہم ادھر سے چل کر ادھر آگئے اور دنیا کمائی۔ کچھ اسباب مہیا ہوئے۔

لیکن اگر پاور ہاؤس سے اوپر کی طرف[1] چلو تو عقل اور ارادہ اور علم وحی اور انجام کار اللہ کی ذات بابرکات آئے گی۔ تو اوپر کی طرف چلو تو ذات حق منکشف[2] ہوگی۔ نیچے کی طرف چلو تو مادہ منکشف ہوگا۔ ہم چونکہ فقط نیچے کی طرف آتے ہیں اوپر جانا ہم نے سیکھا نہیں اس لیے اوپر کے علوم ہم سے غائب ہیں، نیچے کے علوم منکشف ہیں جو ..... اسباب کے درجہ کے علوم ہیں۔

ان الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للآخرۃ۔[3]

تو سائنس دانوں نے ایک مقولے کو تو سمجھ لیا کہ ان الدنیا خلقت لکم دنیا ساری تمہارے لیے ہے، انہوں نے دنیا کو اپنا کر اسے مشینوں کے ذریعے، پاور ہاؤس کے ذریعے، واٹر ورکس کے ذریعے اپنا خادم بنایا تو ان الدنیا خلقت لکم ثابت ہوگیا۔ مگر ایک مقولہ بھول گئے کہ وانکم خلقتم للآخرۃ۔ دنیا تمہارے لیے ہے اور تم اپنے پروردگار کے لیے ہو۔ ایک مقولے پر عمل کرنا باقی ہے تو آدھے حصے پر تو آگئے، آدھا باقی ہے امید ہے کہ چند دن ان اسباب کی مشق کرتے کرتے اس پر بھی آجائیں گے بالآخر مسبب الاسباب تک پہنچ جائیں گے۔

[1] مطلب ہے کہ پاور ہاؤس کو چلانے والی کیا چیز ہے [2] ظاہر
[3] یقیناً دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی اور تم آخرت کے واسطے پیدا کیے گئے ہو۔

تو بات کہیں کی کہیں چلی گئی۔ میرا عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ معجزات اللہ تعالیٰ کا فعل ہیں، جو نبوت کی دلیل ہیں۔ بعض دفعہ لوگ اس کو نہیں سمجھتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسباب کے درجے میں ایسی مثالیں مہیا کر دیں کہ آپ بے تکلف سمجھ سکیں۔ مثلاً حدیث میں فرمایا گیا کہ قیامت کے دن تمام اعمال سامنے کر دیئے جائیں گے اور یہی نہیں کہ نامۂ اعمال سامنے کیا جائے گا بلکہ اعمال کو شکلیں دی جائیں گی، انسان کی زندگی قطار باندھے ہوئے کھڑی ہو گی۔ وہ زمانہ اور مکان سارا کا سارا سامنے ہو گا، گویا دکھلا دیا جائے گا کہ آدمی بیٹھا ہوا وہ حرکت کر رہا ہے جس سے اسے انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہو گی۔ فلاں زمانے میں فلاں مکان میں بیٹھا ہوا ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے وہ بھی سامنے آجائے گا۔ فلاں اور فلاں مکان میں بیٹھا ہوا چوری یا زنا کر رہا ہے وہ بھی سامنے آجائے گا، تو زمانہ اور مکان سب لوٹا دیا جائے گا وہ افعال واعمال سب لوٹا دیئے جائیں گے، سب چیزیں ایک دم سامنے آ جائیں گی۔

اس میں ایک اشکال یہ پیدا ہوا کہ جو زمانہ گزر چکا اسے لوٹا کے کیسے لائیں گے؟ جو مکان ختم ہو چکے انہیں لوٹا کے کیسے لائیں گے؟

تو سیدھا جواب تو یہ ہے کہ اللہ کو قدرت ہے جس نے پہلے بنایا تھا وہ بعد میں بھی بنا دے گا۔ اس نے اعراض[*] کو شکلیں دی تھیں اور تجسیم کر دیا تھا وہاں بھی شکلیں دے گا۔

---

[*] چیزیں جو اپنا وجود نہ رکھتی ہوں انہیں جسم دیدیا، وجود دے دیا۔

لیکن حسی طور پہ جواب یہ ہے کہ ابھی دو تین برس کا عرصہ ہوا، دہلی میں ایک نمائش ہوئی تھی جس میں غیر ممالک نے اپنی اپنی سٹالیں (STALLS) لگائیں اور اپنی ایجادات پیش کیں تاکہ ان کے ملکوں کی ترقیات دنیا کے سامنے آئیں تو روس نے ٹیلی ویژن (TELEVISION) رکھا اور اس کو عملاً دکھلایا یعنی جس میں ایک شخص دوسری جگہ سے بات کر رہا ہے تو فقط آواز ہی نہیں آرہی ہے بلکہ اس کی صورت پر بھی نظر پڑ رہی ہے اس کے ہونٹ بھی حرکت کر رہے ہیں۔ ہاتھ بھی حرکت کر رہے ہیں اور یوں معلوم ہوگا کہ وہ سامنے کھڑا ہوا تقریر کر رہا ہے تو آواز بھی آرہی ہے، ہونٹوں کی حرکت بھی آرہی ہے اور چہرے کی وضع بھی سامنے ہے۔

تو اب آپ ٹیلی ویژن کے ذریعہ وہ زمانہ دوبارہ دیکھ سکتے ہیں جو آپ کے یہاں سے گزر چکا ہے اور اسی مکان اور جگہ میں دیکھ سکتے ہیں جہاں اب وہ گزر رہا ہے مثلاً آپ مغربی سمت یعنی جس طرف سورج غروب ہوتا ہے اس طرف کے ممالک کو ٹیلی ویژن پہ دیکھیں تو چونکہ سورج کی روشنی وہاں ہمارے یہاں کے بعد پڑتی ہے اس لیے وہاں وہ وقت بعد میں نظر آئے گا جو آپ کے یہاں پہلے گزر چکا ہے۔ مثلاً آپ کے یہاں نصف النہار کا وقت گزر چکا اور اگلی سرزمین میں سورج چار گھنٹے کے بعد اس حد تک پہنچتا ہے تو وہاں چار گھنٹے کے بعد نصف النہار کا وقت ہو گا۔

اب آپ اسی سرزمین کو چار گھنٹے کے بعد ٹیلی ویژن پہ دیکھیں گے تو آپ کو پھر نصف النہار کا وقت نظر آئے گا۔ گویا وہی زمانہ دوبارہ لوٹ

کر پھر آپ کے سامنے آگیا جو آپ پر سے گزر چکا ہے اور جسے آپ دیکھ
چکے ہیں۔

یہ اللہ کی قدرت نہیں ہے تو کیا ہے کہ جو زمانہ ہمارے سامنے سے
گزر چکا ہے وہ ہمارے سامنے موجود ہے؟

تو جب دنیا میں مشینوں کے ذریعے سے گزرے ہوئے زمانے کو آپ
چار گھنٹے کے بعد لوٹا کے دکھلا سکتے ہیں اور اسی مکان میں دکھلا سکتے ہیں
جس مکان میں وہ زمانہ گزر رہا ہے۔ تو اگر اللہ عالمِ آخرت میں اور آخرت
کے مکان میں سارے گزرے ہوئے زمانوں کو پھر آپ کے سامنے پیش
کر دے تو اس میں آپ کو تعجب کیا ہے! استبعاد[1] کیا ہے! تو مشینوں نے
وہ دعویٰ ثابت کر دیا جو اسلام نے کیا تھا کہ زمانہ بھی لوٹا دیا جائے گا اور
مکان بھی لوٹا دیا جائے گا۔

حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ سے ایک صاحب نے سوال
کیا جو حضرت کے مریدین میں سے تھے۔ کہ حضرت یہ جو طیّ ارض کا مسئلہ ہے
اس کی کیا حقیقت؟ یعنی اہل اللہ کے لیے زمین لپیٹ دی جاتی ہے اور
وہ ہفتوں کے کام منٹوں اور گھنٹوں میں کر لیتے ہیں اس کی کیا صورت ہے؟
اب ظاہر ہے کوئی دلیل سے سمجھنے کا تو مسئلہ تھا نہیں یہ تو امرِ واقعہ تھا
حضرت حاجی صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا وہ بھی چپ ہو گئے۔ یہ سمجھ
گئے کہ جواب دینا منظور نہیں ہے۔

---

[1] مشکل۔ قیاس سے باہر

حضرتؒ نے سکوت[1] کیا، جمعہ کا دن تھا فرمایا کہ جمعہ میں کتنی دیر ہے
عرض کیا دو گھنٹے۔ فرمایا کپڑے بدل کے میرے پاس آجائیے گا۔ جمعہ پڑھنے
ساتھ ہی چلیں گے۔ وہ کپڑے بدل کر آ گئے۔ اذان میں جب پندرہ منٹ
رہ گئے تو حضرت اٹھے اور ان کی انگلی پکڑ کے لے چلے۔
اب مکہ معظمہ میں حرم شریف میں جانے کی بجائے جبلِ ابو قبیس کی طرف
چلے جو مدینے کا راستہ ہے۔ اور کوئی دس پندرہ منٹ میں پہاڑ آگیا، اس کے
اوپر چڑھے، اُدھر جو اترے تو مدینہ منورہ سامنے تھا اور حرم نبوی کے مینار
سامنے تھے پہنچے تو وہاں اذان ہو رہی تھی۔
اب انہیں کچھ خبر نہیں ہے جو حاجی صاحب کے ساتھ گئے۔ انگلی تھامے
ہوئے حضرت تشریف لے جا رہے ہیں وہاں جا کے جمعہ پڑھا، کچھ لوگ
ملے ان سے بات چیت ہوئی۔ فرمایا کہ چلو واپس چلیں، انگلی تھامی اور
چلے تو تھوڑی دیر بعد جبلِ ابو قبیس آگیا اب جو اِدھر اترے تو حرمِ مکہ کے مینار
نظر آنے لگے، مکہ میں داخل ہو گئے۔ انگلی چھوڑ دی۔ اب یہ اپنے گھر جاتے
ہوئے سوچ رہے ہیں کہ میں نے جمعہ کہاں پڑھا؟ میں ہوں تو مکے میں!
اب حیران ہیں کہ کیا قصہ تھا۔ میں نے مدینے میں حرمِ نبوی میں جمعہ پڑھا
اور موجود ہوں میں مکہ میں یہ کیا قصہ ہے۔ تب سمجھ میں آیا کہ یہ طیّ ارض کا
مسئلہ حاجی صاحب نے زبان سے سمجھانے کے بجائے عمل سے سمجھایا۔
تو کرامت کے ذریعے سے ایک چیز ظاہر ہوئی کہ جو مسافت گیارہ

---

[1] خاموشی

دن میں اونٹ کے ذریعے سے طے ہوتی تھی وہ گیارہ منٹ میں طے ہو گئی۔

یہ طئ ارض جو کرامت تھی، خرقِ عادت تھی، اس پہ اگر کوئی اشکال کرے کہ یہ کیسے ہو گیا تو وہ بوئنگ (BOEING) ہوائی جہاز میں بیٹھ کر کراچی سے ڈھاکہ چلا جائے۔ دو ہزار میل کی مسافت ہے۔ اگر دو ہزار میل کی مسافت آپ بیل گاڑی میں طے کریں تو کئی مہینے لگیں گے اور موٹر میں طے کریں تو ممکن ہے کہ پندرہ بیس دن لگ جائیں۔ لیکن ہوائی جہاز نے دو ہزار کی مسافت اڑھائی گھنٹے میں طے کر دی۔ معلوم ہوا کہ سرعت[1] کی کوئی انتہا نہیں۔ جو مسافت دس بیس برس پہلے ہم چھ مہینے میں طے کرتے تھے وہ چھ گھنٹے میں طے ہوئی۔ اور چھ گھنٹے کی بجائے اب جبکہ بوئنگ ہوائی جہاز آگیا تو وہ اڑھائی گھنٹے میں طے ہوئی۔ اور اب ایک اور ہوائی جہاز کا اعلان کیا جا رہا ہے وہ ایک گھنٹے میں پندرہ سو میل اڑان کرے گا تو اب دو ہزار میل سوا گھنٹے کے اندر طے ہو جائیں گے۔ جدہ ڈھائی ہزار میل ہے وہاں آپ دو گھنٹے کے اندر پہنچ جائیں گے۔

گویا صبح کا ناشتہ کر کے چلے کہ میں ذرا عمرہ[2] کر آؤں، وہاں آٹھ بجے پہنچ گئے، عمرہ کیا اور کھانا ظہر کے وقت گھر آ کے کھا لیا۔ پھر جی چاہا کہ دوسرا عمرہ کر دوں تو ظہر کے بعد پھر ہوائی جہاز میں بیٹھے اور دو گھنٹے میں پہنچ گئے عصر اور مغرب کے درمیان عمرہ کیا اور مغرب پڑھ کے پھر سوار ہو گئے

[1] تیز رفتاری [2] اسے چھوٹا حج بھی کہتے ہیں سال میں جب اور جتنی مرتبہ چاہیں کر سکتے ہیں

اور عشاء اپنے گھر آ پڑھی۔

اگر پچاس برس پہلے کوئی یہ کہتا کہ میں دو گھنٹے یا تین گھنٹے میں مکے پہنچ جاؤں گا تو لوگ اسے دیوانہ سمجھتے لیکن آج وہ امر واقعہ ہے۔

تو جب مادی اسباب میں یہ قوت ہے کہ مہینوں کی مسافت گھنٹوں اور منٹوں میں طے ہو جائے۔ تو روحانیات میں یہ طاقت کیوں نہیں ہے کہ مہینوں اور برسوں کی مسافت پل بھر میں طے ہو جائے۔

اگر گاگرین (تقریباً چوبیس گھنٹوں میں) دنیا کے سترہ چکر کر سکتا ہے تو اللہ کے رسول آسمانوں کی پانچسو برس کی راہ پل بھر میں کیوں نہیں طے کر سکتے؟ اگر یہ ممکن ہے تو وہ بھی ممکن ہے۔ یہ مادیات میں ممکن ہے تو وہ روحانیات میں اس سے زیادہ ممکن ہے اس لیے کہ روحانیات میں لطافت زیادہ ہے

اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ لطافت جتنی زیادہ ہو گی اتنی ہی طاقت زیادہ ہو گی۔ تو روحانیات میں جو طاقت ہے وہ مادیات میں نہیں ہے اور ان مادیات کو ہلانے والی طاقتیں وہی روحانی اور علمی طاقتیں ہیں کچھ اسباب کے درجے ہیں کچھ روحانیات میں اعلیٰ طاقتیں ہیں جن کا کنکشن اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے۔

تو معجزات انبیاء کے نام پہ ظاہر ہوئے مثالیں ہم نے بتا دیں تاکہ ان مثالوں کے ذریعہ سے معجزات ثابت ہو جائیں اور انہیں عقلیں مستبعد[1]

[1] قیاس سے باہر

نہ سمجھیں۔ اللہ کے رسول نے دعویٰ کیا اور اللہ نے دعویٰ کیا کہ اِقتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَ انشَقَّ القَمَر چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ تو فلاسفہ گو ن ستھون[1] تھے کہ بھلا چاند میں اور آسمانوں میں خرق و التیام[2] تو محال ہے نہ پھٹن ہو سکتی ہے نہ ٹوٹ پھوٹ سکتی ہے۔

لیکن آج کے فلسفے نے یہ ثابت کیا کہ ٹوٹ پھوٹ بھی ممکن ہے اور اس کے اندر جانا بھی ممکن ہے تو پہلے وہ پھٹے گا جبھی تو آپ اس کے اندر جائیں گے۔ لوگ تو زمینیں الاٹ (ALLOT) کرا رہے ہیں اب چاند کے اندر جا کے رہیں گے۔

تو بہر حال چاند میں کوئی دروازہ کوئی دراڑ کوئی شق[3] ہو گا جبھی تو اندر پہنچیں گے۔ اگر خرق و التیام اور پھٹن محال ہوتی تو یہ تصور بھی محال ہوتا۔ تو کل تک محال تھا آج آپ نے ممکن ہونا ثابت کر دیا کہ اس کے اندر جا سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ سواریاں تیار کر رہے ہیں اور زمینیں الاٹ کرا رہے ہیں۔

تو اگر اللہ کے رسول نے یہ دعویٰ کیا کہ میرے انگلی کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے اور اس میں پھٹن واقع ہو گئی تو آپ تو بجلی کی طاقت سے پھاڑ سکتے ہیں۔ اللہ کا رسول اپنی روحانی طاقت سے کیوں نہیں پھاڑ سکتا جب کہ روحانی طاقت بجلی کی طاقت سے کہیں زیادہ اونچی اور کہیں زیادہ طاقت ور ہے۔

---

[1] منہ پھلا کر چپ تھے [2] پھٹ جانا اور پھر آپس میں مل جانا [3] پھٹن

تو جتنے معجزات ہیں ..... آج کی ایجادات نے ان کو نہ صرف ممکن بنا دیا بلکہ انہیں عقل کے قریب کر دیا کہ وہ واقعات صحیح ہیں۔

اگر آپ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ معراج کے جانے کے وقت اللہ تعالیٰ نے شق صدر فرمایا یعنی سینہ کھول کر آپ کے قلب مبارک کو چاک کیا گیا۔ اور اس میں حکمت و ایمان زیادہ سے زیادہ بھر دیا گیا جتنا پہلے تھا اس سے بھی زیادہ۔ اور پھر فرشتے نے برابر کر دیا۔ تو لوگ ہنستے تھے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے! دل کھلا اور یہ زندگی کا مدار ہے جب دل کھل گیا تو آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن آج کی ایجادات میں ایسے ایسے نازک اپریشن ہیں کہ دل کھول کر اس میں کچھ بھر دیتے ہیں اور پھر سی دیتے ہیں لیکن انسان زندہ رہتا ہے اس کی حرکت کو مشینوں کے ذریعے قائم رکھ کر اپریشن کر دیا جاتا ہے۔ تو جب مادی اسباب سے قلب کا شق کرنا ممکن ہے تو روحانی اسباب سے قلب کا شق ہونا کیوں ممکن نہیں؟ جب کہ روحانی قوتیں مادی قوتوں سے زیادہ ہیں۔ تو تمام معجزات میں یہی دیکھتے چلے جائیے۔

آپ آج اس لاؤڈ سپیکر کے ذریعے آوازیں لگاتے ہیں حدیث میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ بنایا تو حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ اَذِّن فِی النَّاسِ بِالحَجِّ یَاتُوکَ رِجَالاً ط اے ابراہیم اعلان کر دو کہ اللہ کا گھر بن گیا، لوگو حج کرو۔ عرض کیا آواز کیسے پہنچاؤں گا۔ فرمایا اس کے ذمہ دار ہم ہیں تم آواز لگاؤ، تو مقام ابراہیم پہ کھڑے ہو کر آواز لگائی۔

حدیث میں ہے کہ مشرق و مغرب میں وہ آواز گونجی اور جس نے ایک دفعہ
لبیک کہا اسے ایک حج نصیب ہوا جس نے دو دفعہ لبیک کہا اسے دو دفعہ
حتی کہ ان روحوں کو بھی آواز پہنچی جو ماؤں کے پیٹ کے اندر تھیں یعنی ماں
کے پیٹ میں بچوں نے بھی وہ آواز سنی اور جس نے جتنی دفعہ لبیک کہا اسے
اتنے ہی دفعہ حج نصیب ہوا۔ تو آپ کے نزدیک یہ بات بڑی ناممکن تھی کہ
مکہ میں بیٹھ کر آواز لگائی جائے اور وہ مشرق و مغرب میں پہنچ جائے۔ لیکن
ریڈیو نے اس مسئلہ کو حل کر دیا۔

تو جب آپ مادی اسباب سے آواز کو مشرق سے مغرب تک پہنچا
سکتے ہیں تو اللہ کا رسول روحانی اسباب سے اپنی آواز مشرق سے مغرب
تک کیوں نہیں پہنچا سکتا۔ جب کہ مادیات کثر ہیں اور روحانیات میں
لطافت زیادہ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ منبر نبوی پر بیٹھ کر آواز دیتے ہیں یا ساریۃ
الجبل جب کہ حضرت ساریہؓ اڑھائی سو تین سو میل پر عراق کے ملک میں
لڑ رہے ہیں۔ لیکن لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔ حالانکہ ان سے غلطی ہوگئی تھی
اور اندیشہ تھا کہ حضرت ساریہ شکست کھا جائیں۔ ادھر مدینے میں اس
وقت فاروقِ اعظم منبر پر جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے ان پر وہ میدان منکشف[1]
ہوا تو وہیں سے کہتے ہیں یا ساریۃ الجبل الجبل اے ساریہ پہاڑ کی
آڑ پکڑو اگر فتح چاہتا ہے

---

[1] ظاہر ہوا

یہ آواز جب ان کے کان میں پہنچی تو انہوں نے پہچانا کہ یہ آواز تو امیر
المومنین کی ہے اسی وقت پہاڑ کی آڑ پکڑی چنانچہ مسلمانوں کو فتح ہوگئی
آگے معلوم ہوا کہ آواز دینے والے فاروقِ اعظمؓ تھے۔

وہاں نہ لاؤڈ سپیکر تھا، نہ ریڈیو تھا اور نہ کوئی پاور ہاؤس تھا مگر روحانی
طاقت سے آواز پہنچ گئی۔ اگر اسے کوئی ناممکن سمجھے تو وہ ریڈیو کی ایجاد کو
دیکھ لے۔ جب مادی اسباب سے آواز پہنچ سکتی ہے تو روحانی قوت سے
کیوں نہیں پہنچ سکتی؟ اور ریڈیو میں بھی لطیف طاقت ہی آواز کو پہنچاتی ہے
لوہا، لکڑی آواز نہیں پہنچاتی۔ تو جو اس لطیف طاقت سے بھی زیادہ لطیف
ہو وہ یقیناً ایسی آواز پہنچا سکتی ہے جو آسمانوں کے اندر بھی چلی جائے گی دنیا
ہی دنیا میں نہیں رہے گی۔

تو جتنے بھی خوارق ہیں، جتنے بھی معجزات ہیں ان سب کے لیے اس
دور میں کچھ ایسی مثالیں مہیا ہوگئیں کہ جو لوگ معجزات کا انکار کرتے رہے ہیں
آج وہ ذلت کے ساتھ واپس ہو رہے ہیں اور ان کے ماننے پر مجبور ہو رہے
ہیں۔

یہی حال احکام کا بھی ہے کہ جن احکام میں کل تک شبہات کیے جاتے
تھے کہ یہ عقل کے خلاف ہیں جب حادثات پیش آئے اور مجبور ہو کر انہیں
چند دنوں کی طرف رجوع کرنا پڑا تو آج کہتے ہیں کہ اس سے تو یہی مسئلہ زیادہ بہتر تھا۔
تو بہرحال بیّنات[1] اور دلائل جو دلیلِ نبوت ہیں وہ معجزات ہیں اور خود

---

[1] روشن اور واضح دلائل اور معجزات۔

نبی کی ذات احکام کے حق ہونے کی دلیل ہے۔ تو جب نبی کی حقانیت[1]
ثابت ہوگئی تو احکام کی حقانیت ثابت ہوگئی اور نبی کی حقانیت اور
نبوت معجزات سے ثابت ہوتی ہے اور معجزات کو عقل اور فہم سے قریب
کرنے والی چیز آج کے زمانے کی ایجادات ہیں۔ کل تک عقیدے صحیح تھے
تو مثال کی ضرورت نہیں تھی، نبی کی بات کانوں میں پڑی لوگوں نے مان
لیا۔ آج لوگ اسباب کے بندے ہو گئے ہیں اس لیے اس وقت تک
نہیں مانتے جب تک کہ اسباب رہنمائی نہ کریں۔ تو اسباب کے درجے میں
اللہ تعالیٰ نے اپنی ایجادات پیدا کر دیں کہ ان کو دیکھو اور معجزات کو قریبِ
عقل سمجھو تاکہ انکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔

اب اگر آدمی اسے مانے گا تو وہ سب کچھ پا لے گا اور اگر نہیں مانے
گا تو اللہ تعالیٰ کی حجت اس پر تمام ہو گئی

تو آیت کریمہ میں فرمایا گیا لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت ط ہم نے
اپنے رسولوں کو کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا۔ کھلی کھلی نشانیاں معجزات
ہیں تو معتقد کے اوپر تو وہ بالکل کھلی ہوئی ہیں منکر کے اوپر بند تھیں تو اسباب
و وسائل اور ایجادات نے انہیں کھول دیا۔ تو کوئی عقیدت سے مانے
اور نہیں مانتا تو پھر ان دلائل اور سائنس کی ترقیات سے مانے، اس صورت
میں تو اسے ماننا ہی پڑے گا۔

لا یبقیٰ علیٰ ظہر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخلہ

---

[1] سچائی

اللّٰہ کلمۃ الاسلام بعز عزیز و ذل ذلیل ط

فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہ روئے زمین پر کوئی کچا اور پکا گھرانہ،
خیمے کا اور اینٹ کا گھر باقی نہیں رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہیں
ہو جائے گا بعز عزیز و بذل ذلیل ط خواہ طوعاً مانو یا کرھاً مانو، رغبت
سے مانو یا مجبور ہو کر مانو۔

تو رغبت سے ماننے کا مطلب ہے عقیدت کی خوش اعتقادی سے
ماننا اور مجبور ہو کر ماننا دنیا کے واقعات اور حادثات کو دیکھنے کے بعد ماننا
تو بجائے اس کے جھک مار کے اور مجبور ہو کر مانا جائے آدمی سلامتیِ قلب
سے ہی کیوں نہ مانے تاکہ ایمان بھی مضبوط ہو اور اس پہ کلی اور کامل اجر و ثواب
بھی ملے۔

غرض رسولوں کی حقانیت اور نبوت کی دلیل بیّنات ہیں اور خود رسول
کتاب اللہ کی حقانیت کی دلیل ہیں کہ جب حقانی نے پیش کیا تو یقیناً یہ
قانون اللہ کی طرف سے ہے اس لیے کہ رسول کے ہاتھ پر افعالِ[1] خداوندی
ظاہر ہو رہے ہیں۔ جس کے بعد ظاہر ہے کہ زبان پہ بھی اقوالِ[2] خداوندی ظاہر
ہوتے ہیں جیسا کہ ہاتھ پہ غلطی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح زبان بھی غلطی نہیں کر
سکتی اس لیے فرمایا کہ وانزلنا معھم الکتاب ط نبیوں کے ساتھ ہم نے
کتاب اتاری جس میں قانون اور احکام ہیں۔ ان قوانین کے سمجھنے کے لیے ہم
نے ایک میزان رکھی ہے جس کے دلائل اور وجوہ نقلی بھی ہیں اور عقلی بھی ہیں۔

---

[1] جمع فعل کا معنی کام [2] جمع قول کی معنی باتیں۔

نقلی دلیل کی سب سے بڑی وجہ روایت اور سند[1] ہوتی ہے کہ اللہ کے رسولوں تک سلسلہ ملا ہوا ہو بیچ میں انقطاع[2] نہ ہو، تو جب رسول کی حقانیت واضح ہو جائے گی اور رسول کا کلام ثابت ہو جائے گا تو وہ بھی حق ہوگا خواہ ایک واسطے سے ثابت ہو یا دو سے یا دس اور بیس سے۔ بغرض واسطے صحیح ہونے چاہئیں۔

تو روایت کے درجہ میں تو یقین کا ذریعہ سند بنتی ہے جبکہ روایت کے پہنچانے والے سچے اور حقانی لوگ ہوں اور ان کے کیریکٹر (CHARACTER) اعلیٰ ہوں اور سلسلہ ملا ہوا ہو تو روایت کے ماننے پر آدمی دلیل سے مجبور ہوتا ہے اور وہ دلیل سند ہے۔ یا پھر آدمی وجوہ[3] سے اور شواہد[4] سے مجبور ہوتا ہے۔ یعنی فقہی[5] وجوہ ہوں اور عقلی دلائل ہوں کہ جس سے ان جزئیات کا حقانی ہونا معلوم ہو جو اہل علم جانتے ہیں۔ ان سے آدمی سیکھے تو واضح ہوگا کہ فلاں مسئلے کی یہ دلیل ہے۔ نقلی دلیل الگ واضح ہوگی اور عقلی دلیل الگ۔

اسلامی قانون کی صورت میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اصول فقہ میں سب جمع کر دیا۔ ھدایہ[6] کو دیکھا جائے تو ہر مسئلے کی ایک نقلی دلیل ملے گی ایک عقلی دلیل ملے گی۔ کہا جائے گا پیغمبر سے یہ ثابت ہے لہٰذا یہ مسئلہ ہے اور آگے کہیں گے کہ عقل سلیم اس کی مؤید[7] ہے۔ یہ عقلی دلیل ہوگی۔ بغرض ہر ہر مسئلے کے لیے نقلی اور عقلی دلائل پیش کیے ہیں۔

---

[1] روایت بیان کرنے والوں کا سلسلہ [2] کٹ جانا [3] دلائل [4] ثبوت
[5] علم اصول فقہ کے مطابق دلائل کا ہونا [6] فقہ کی ایک کتاب کا نام [7] تائید کرنے والی

تو احکام نبی کی وجہ سے حق ثابت ہوا اور اس کتاب کی حقانیت نبی کی وجہ سے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کو قبول کرنے کے لیے کچھ شواہد[1] اور وجوہ بھی رکھے ہیں اور وہ عقلی و نقلی دلائل ہیں اور روایتی و درایتی[2] وجوہ ہیں کہ جن کے ذریعہ سے آدمی اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اور اس کے کلام کو پہچانے گا۔

غرض اسلام اللہ کے رسول کے ذریعہ آیا اور اپنے ساتھ حجتیں[3] لے کر آیا۔ ضعیف اور کچی چیزیں لے کر نہیں آیا بلکہ پکی اور اٹل چیزیں لے کر آیا۔

ادھر انسان میں استعداد[4] اور رکھ دی گئی، انبیاء نے اس تعداد کو ابھار کر اس جاہل کو عالم اور اس ظالم کو عادل بنایا۔ اگر دنیا میں انبیاء نہ آئیں تو انسان ڈھوروں اور ڈنگروں کا مجموعہ ہے جس میں کوئی آدمیت نہیں ہے۔

تو آدمیت انبیاء بھرتے ہیں اس لیے کہ آدمیت کا خلاصہ علم اور عمل ہے جو انبیاء کے راستہ سے آتا ہے۔ ورنہ انسان تو اپنی ذات سے ظلوم و جہول ہے۔ بس خوبی ہے تو صلاحیت کی ہے اس کے علاوہ اس کے اندر کوئی خوبی نہیں ہے۔

تو یہ مدارس جو قائم کیے جا رہے ہیں ان میں نبوت کی تعلیم دی جا رہی ہے اور انبیاء کے علوم پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ انسانوں کی صلاحیتیں

---

[1] ثبوت اور دلائل [2] نقلی اور عقلی [3] دلائل [4] قابلیت

اجاگر ہوں اور ان میں ظلم کے بجائے عدل اور جہل کے بجائے علم پیدا ہو جائے جو انبیاء علیہم السلام کے علم سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

یہ چند باتیں اس آیت کے تحت میں عرض کر دی گئی ہیں حق تعالیٰ ہمیں اس دین کو ماننے کی، اس کو استعمال کرنے کی اور اس قانون پہ چلنے کی توفیق دے۔ اور اللہ ہمارا انجام بخیر فرمائے۔ آمین

تمت بالخیر